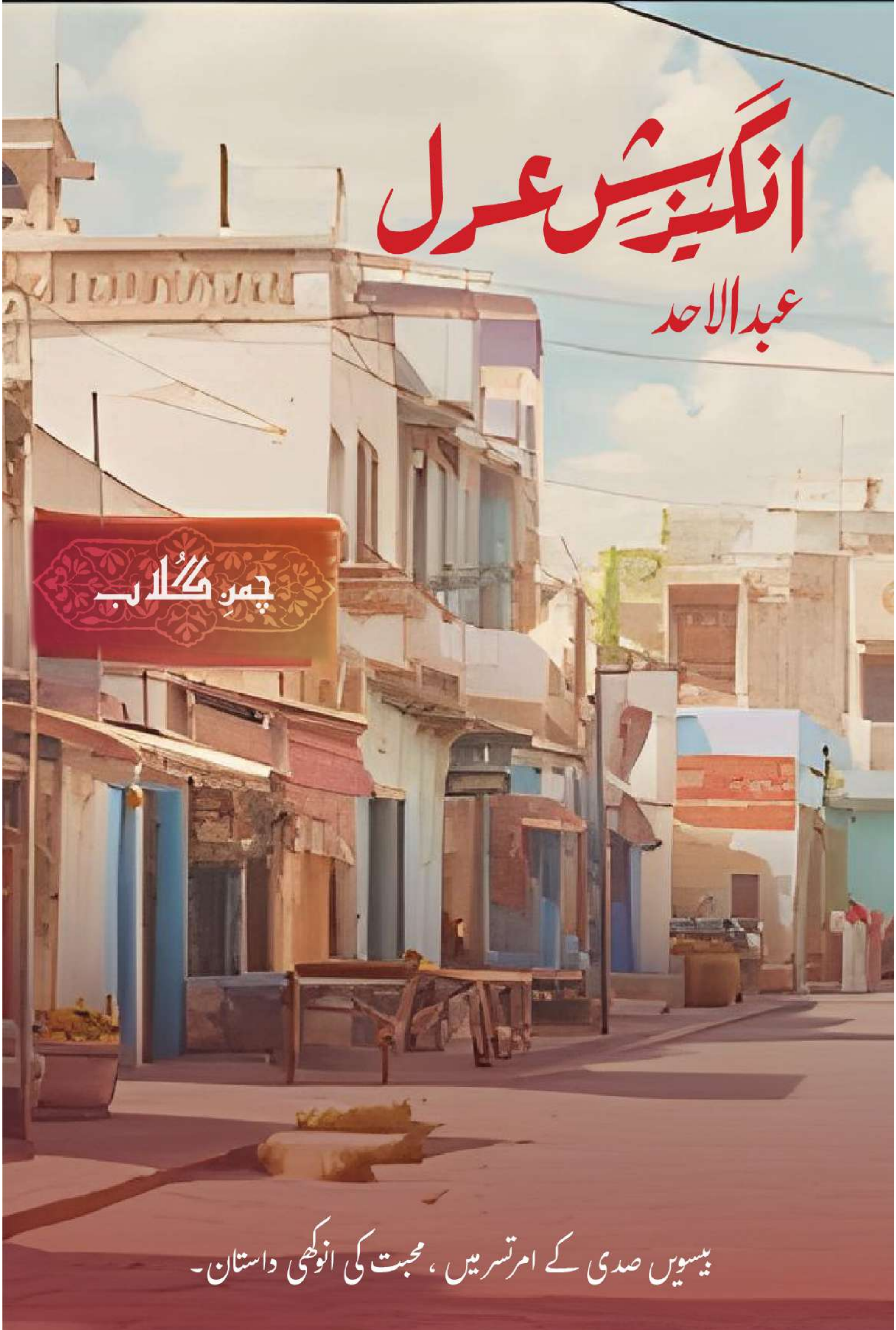
انگلش گرل

عبدالاحد



بیسویں صدی کے امرتسر میں، محبت کی انوکھی داستان۔

پیشِ لفظ

شروع اللہ کے نام سے، نہایت مہربان اور رحم فرمانے والا۔

اللہ کے فضل و کرم سے، آج میری کتاب "انگیزشِ عدل" آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے پہلے یہ کتاب بھارت میں شائع ہوئی اور تب سے میرے وفادار قارئین نے ادھم مچائے رکھا تھا، کہ اسے پاکستان میں کب لایا جائے گا؟ الحمد للہ۔ اللہ کا جتنا شکر ادا کیا جائے اتنا کم ہو گا، آج یہ کتاب خواب سے حقیقت بن بیٹھی ہے۔

انگیزشِ عدل کا سفر جولائی ۲۰۲۳ میں شروع ہوتا ہے۔ تاریخ، چاہے مسلمانوں کی ہو، غیر مسلم کی، ہمیشہ سے میری دلچسپی کا مرکز رہی ہے۔ میرے مطابق تاریخ زندگی جینا سکھاتی ہے۔ ماضی کا حال سے موازنہ ہر زمانے کی ضرورت رہا ہے۔ یوں ہی ہم آج کے زمانے کی ترقی اور پذیرائی کو ناپ سکتے ہیں۔ یوں ہی ہم وہ غلطیاں دہرانے سے باز آسکتے ہیں جو ہمارے پرکھوں نے کیں۔

تاریخ سے اس دلچسپی نے مجھے انگیزشِ عدل لکھنے پر مجبور کیا۔ اس کا سب سے ابتدائی نام "چمنِ گلاب" تھا۔ میں نے کچھ حقیقی واقعات کے پس منظر میں ایک کہانی گڑھ لی، اور دو کردار: یاسمین اور البرٹ، ان کے گرد پوری کہانی کو گھما دیا۔

اب ایسا نہیں تھا مجھے کہانی پسند نہیں آئی تھی، یا کردار اچھے نہ لگے تھے۔ مگر کوئی تشنگی سی تھی۔ میں محسوس کر پا رہا تھا۔ جس جوش کو لے کر یہ کہانی لکھی تھی وہ نہ جانے کیوں جھاگ ہو گیا تھا۔ اس لیے میں نے اسے ایسے ہی رہنے دیا۔ اور اپنے طویل ناول "بساطِ متوفی" پر کام بدستور جاری رکھا۔

مگر پھر دنیا میں بدلاؤ آتا ہے۔ اکتوبر 7، جدید دنیا کا ایک تاریخی دن ہے، جس کا ذکر آنے والے وقتوں میں تاریخی کتابوں میں بھی کیا جائے گا۔ فلسطین پر ہونے والے مظالم دنیا بھر میں نشر ہوئے۔ فلسطین کے مجاہدین کے خلاف نہ جانے کتنے کتنے پراپگینڈے ہوئے۔ اور میں وہ سب دیکھ کر بالکل دنگ رہ گیا تھا۔ سب ناقابلِ یقین تھا۔ کہ کیسے دنیا نے حقیقت سے نظریں چرائیں۔ کیسے دنیا نے مظلوم فلسطینیوں کو دھوکہ دیا۔

انگیزشِ عدل

پھر ایک دن، میں نے فراغت میں انگیزشِ عدل کا مسودہ پڑھ ڈالا۔ کہانی برِ صغیر کی تھی، زمانہ مختلف تھا، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے کہانی میں لکھے جانے والے حالات اور فلسطین کے حالات زیادہ مختلف نہ لگے۔ اس زمانے میں بھی باغیوں کو ظلم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بھی ہمارے لوگوں کو بے جھجک مارا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بھی ایسے ہی پراپگینڈے تھے۔ جیسے آج دیکھنے کو ملتے ہیں۔ زمانہ مختلف تھا، کردار بدل گئے تھے، کوئی چیز نہیں بدلی تھی تو وہ حالات تھے۔

پھر مجھے سمجھ آیا کہ اس کہانی کو لے کر میرا جوش وخروش آخر چل کیوں بسا تھا؟ میں نے پہلے انگیزشِ عدل بغیر کسی مقصد کو ذہن میں رکھے، لکھ ڈالا تھا۔ مگر اب میرے پاس ایک مقصد تھا۔ ایک خواب تھا۔ ایک پیغام تھا۔ جو اس رومانوی کہانی کے ذریعے مجھے اپنے قارئین کے دلوں میں اتارنا تھا۔

سوڈسمبر کو میں نے اسے نئے سرے سے پر کھا۔ اضافے کیے، اس مقصد کو شامل کیا۔ اور پھر یہ کہانی اللہ کے فضل وکرم سے پچیس جنوری کو میرے قارئین کی خدمت میں پیش کی گئی۔

انگیزشِ عدل ویسے تو ہے ایک رومانوی کہانی، مگر اسے محض رومانوی کہانی کے طور پر نہ پڑھیں۔ اس میں چھپا مقصد پرکھنے کی کوشش کریں۔ اور شعوری یالاشعوری طور پر، آج کے حالات اور اس کہانی میں لکھے حالات کا آپس میں موازنہ کریں۔ امید کرتا ہوں، آپ کو یہ سفر بالکل ویسے ہی بھائے گا، جیسے میرے اور میرے قارئین کو بھایا تھا۔

آخر میں، میں خصوصی طور پر شکریہ ادا کرنا چاہوں گا اپنے ہر آنلائن قاری کا۔ جنھوں نے انگیزشِ عدل پڑھا، اس پر ری ویوز دیے، ڈھیروں ڈھیر ایڈیٹس بنا کر اسے شہرت دی۔ پذیرائی دی۔ تنقید بھی موصول ہوئی جو ہمیشہ کی طرح دل کھول کر قبول کی۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ نام لینا چاہوں گا۔ سب سے پہلے ثبت کا۔ جنھوں نے اسے اپنے پلیٹ فارم میں پبلش کیا۔ ارشنہ شاہد کا، جنھوں نے اسے پروف ریڈ کیا۔ بدر الرجاء کا، انھوں نے بھی اسے پروف ریڈ کیا۔ منیبہ اسلم کا، جنھوں نے اسے بہت ابتدائی دنوں میں پڑھ کر، میری حوصلہ افزائی کی۔ اگر آپ کے تبصرے نہ ہوتے تو میں کبھی اسے دوبارہ کھولنے کی ہمت نہ کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ رمیساء شکیل احمد اور مریم رحیم باجی کا۔ جو ہمیشہ میری حوصلہ

افزائی کرتی رہیں۔

آخر میں اونلو کر پبلیکیشنز کا خصوصی شکریہ جنھوں نے میری کتاب کو قابلِ اشاعت گردانا تھا۔

آپ کا لکھاری

عبد الاحد

انگیزشِ عدل

جب خون بہتا ہے محبت کی خاطر
اَرض کی محبت کے خاطر
انسانیت سے محبت کی خاطر
تب خون انمول بن جاتا ہے
ہیروں سے زیادہ قیمتی بن جاتا ہے
وہ خون خون نہیں رہتا،
وہ لافانی قوت بن جاتا ہے
وہ خون جنون و عزم بن جاتا ہے
وہ خون ایک شمع بن جاتا ہے
جو دلوں میں جلتی ہے
روح کو سلگاتی ہے
اور یہی خون لامحدود ایندھن بن جاتا ہے
جب جسم چھیدے جاتے ہیں گولیوں سے
جب گردنیں اڑائی جاتی ہیں تلواروں سے
جب قید بنائی جاتی ہے مقدر گروہ کی
وہ گروہ جو لڑتا اپنی آزادی کے واسطے
بہاتا خون انصاف کی خاطر، عدل کی خاطر
اس انگیزش کی خاطر جو موت سے بے خوف کر دے

تو سرکشی و بغاوت کی لہر جنم لیتی ہے
اور جان لو یہ بات تم آج،
لڑتا ہے انسان جو آزادی کی خاطر
نہ لڑتا ہے اپنے لیے، اپنی جان کے لیے
بلکہ لڑتا ہے وہ اپنی نسل، اپنے لوگوں کے لیے
جانتا ہے قید اذیت ناک ہوتی ہے
اور موت کو اس قید سے بہتر وہ جان لیتا ہے۔
اس لیے ایثار کا جذبہ دل میں وہ رکھتا ہے
خون اپنا بہاتا ہے، پیاروں کو اپنے گنواتا ہے
تو جب دریافت کرو کہانی ایک ایسے انسان کی تم
جو عدل کی انگیزش لیے، لڑتا ہے آزادی کی خاطر
تو کبھی بھولے سے بھی تذلیل نہ اس کی قربانیوں کی کرنا۔
کہ اگر نہ ہو بے لوث انسان ایسے دنیا میں
تو طلوعِ آفتاب کو دیکھ کر، تم یہ سوال کرتے خود سے
کہ آزادی کا چڑھتا دن نہ جانے کیسا دکھائی دیتا ہے؟

......☆☆☆......

تاریخ ہے پچیس مارچ۔
سال ہے انیس سو پندرہ۔
اور ملک ہے......سنگاپور!
سنگاپور کی برٹش کراؤن کالونی میں کسی تہوار کا سماں ہے۔

انگیزشِ عدل

خاکی یونی فارم میں ملبوس برطانوی سپاہیوں کی پریڈ جاری ہے۔

ٹُرم کے گرجدار سُر، ڈھول کی پرزور گونج فضا میں گردش کر رہی ہے۔

اولوالعزم برطانوی فوجی، سینا پھلائے، آنکھوں میں فتح کا ازلی تاثر سجائے سلطنتِ برطانیہ کے جھنڈے بلند کر رہے ہیں۔

مقتل کے گرد، بنجر میدانوں میں پندرہ ہزار کے قریب تماشائی جمع ہیں۔

بائیس مسلمان نوجوان، مقتل میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان سے فاصلے پر بندوقیں تانے، ایک سو دس برطانوی سپاہی متعین ہیں۔ وہ اپنے کمانڈر کے حکم کے منتظر ہیں۔ حکم ملتے ہی، انھوں نے گولیوں سے ان بائیس نوجوانوں کے جسم چھید دینے ہیں۔

اب سوال ابھرتا ہے، یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟

کون تھے یہ نوجواں مسلمان؟

یہاں تک نوبت کیسے آئی؟

آیئے جانتے ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم کے وقت، دس لاکھ سے زائد ہندوستانی مردوں نے بیرونِ ملک، برطانوی فوج کی خدمت کی۔ ان مردوں کو عام زبان میں "سی پائیز (sepoys)" بھی کہا جاتا ہے۔

اور یہ کہانی بھی ان سیپائیز کے ایک مسلمان لشکر کی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں۔

اکتوبر انیس سو چودہ میں، سیپائیز کا ایک لشکر سنگاپور پہنچا۔

کرنل نے اعلان کیا کہ وہ لوگ ہانگ کانگ میں تعینات کیے جائیں گے۔

تاہم ان کے درمیان ایک افواہ گردش کرنے لگی، کہ انھیں دھوکہ دیا جا رہا تھا، اور در حقیقت انھیں ترکی بھیجا جائے گا، جہاں جبراً انھیں اپنے ترک برادرانِ مسلمان سے لڑوایا جائے گا۔

البتہ سیپائیز خاموش رہے اور اس افواء کی تصدیق ہو جانے کا انتظار کرنے لگے۔

اور جب الوداعی پریڈ میں ہانک کانگ کا کوئی ذکر نہ آیا، تو سیپائیز کو یقین ہو اچلا تھا کہ وہ افوائیں محض افوائیں نہ تھیں۔ بلکہ وہ سچ تھیں! انھیں واقعتاً دھوکہ دیا جارہا تھا۔

اور پھر ابھرا اسماعیل خان، جس نے چلائی ہوا میں گولی۔ دیا اشارہ مسلمان سیپائیز کو، کہ بغاوت کے پر زور دور کا آغاز ہو چکا ہے!

دوپہر تین بجے کے قریب، سنگاپور کی برٹش کراؤن کالونی کو ان آٹھ سو سیپائز نے غالب لیا۔ انھوں نے چالیس برطانوی سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اور کمانڈر کو اپنے ہی محل میں نظر بند کیا۔

برٹش کراؤن کالونی ان کے قبضے میں تھی۔

لیکن، دو دن بعد برطانوی جہاز سنگاپور بھیجے گئے۔ جنگ کا سماں چھڑ گیا اور باآسانی ان برطانوی لشکروں نے ان سیپائز کو مار گرایا۔

ان آٹھ سو سیپائز میں سے، اکثریت ماری گئی، قلیل التعداد کو قید کیا گیا، بعض جنگلات میں فرار ہو گئے اور بقایا کو، ان بائیس نوجوانوں کی طرح، سرِ عام موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

اور کیا یہ تحریکِ بغاوت دنیا میں ابھرنے والی واحد کوشش تھی؟

ہرگز نہیں۔ دنیا بھر میں ایسی بیشتر باغی تحریکیں وجود میں آئیں۔ اور انجام کیا تھا؟ مسلمان فوجیوں کو خطیر تعداد میں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اور جنھیں موت نے گلے نہ لگایا، ان کی زندگیاں قید خانوں کی نذر ہوئیں۔

اور کیا قتل و غارت کا یہ سلسلہ پہلی بار شروع ہوا تھا؟

ہرگز نہیں۔ خوں ریزی کے ایسے کھیل سالوں سے رچائے جارہے ہیں اور آئندہ بھی رچائے جائیں گے۔

لیکن، ان موت اور فریب کے کھیلوں میں پتہ ہے کون پستا ہے؟

وہ عام لوگ، جن کے باپ بھائی شوہر مار دیے جاتے ہیں۔ جن کی زندگی کی کل متاع ایک جھٹکے میں چھین لی جاتی ہے۔ تکلیف و تڑپ، اور زندگی بھر کی دکھ بھری یاد ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ جنگوں کے اختتام میں پورے

پورے خاندان اجڑ جاتے ہیں!

......☆☆☆......

امرتسر، ہندوستان۔

سال ۱۹۲۰

زمین کی کوکھ سے آزادی حاصل کر کے، سنہرے گنبد والے گردوارے کی اوٹ سے سورج طلوع ہو رہا تھا۔ سورج کی کرنوں کی حدت میں وہ بھوری عمارتیں سنہری دکھائی دے رہی تھیں۔ ان پر نہایت حسین نقش بنے ہوئے تھے۔ فجر کی اذان کانوں میں داخل ہونے کی دیر تھی، اور امرتسر کی مسلمان کالونی کے ہر فرد کا دن شروع ہو جاتا تھا۔

تنگ گلیاں بچوں کی کھل کھلاہٹ، سائیکلوں کی "رنگ رنگ" اور جوتوں کی چاپ سے جی اٹھتی تھیں۔

شہر گردوار، امرتسر ایک وسیع شہر ہے۔ نہ صرف اس کا رقبہ وسیع ہے، لیکن یہ مختلف ثقافتوں، روایات اور مذاہب کا گھر ہے۔ تمھیں یہاں مختلف رنگوں کے لوگ نظر آئیں گے، گویا اس شہر میں ایک جہاں آباد ہو۔

اتنی انفرادیت کے باجود بھی ایک شے تھی جو ان سب میں مشترکہ تھی۔

ان کے وجود پر تازہ زخم لگائے گئے تھے۔ جس کی بدولت، کچھ مدت کے لیے ہی سہی، وہ سب متحد ضرور ہو گئے تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ زخم کیسے لگے تھے اور ان کا ذمہ کس کو جائے گا؟

سوال کا جواب تم جلد جان جاؤ گے۔

فی الحال اپنی کہانی کا آغاز کرنے ہم اس مسلمان کالونی کی ایک گلی سے گزرتے ہیں۔

تنگ گلی کے دائیں اور بائیں اطراف عمارتیں کھڑی تھیں، جن کی دیواریں آپس میں چسپاں تھیں۔ جہاں مرد خطیر تعداد میں نظر آئیں گے، وہاں عورتیں اقلیت میں تھیں۔ مردوں نے سفید اچکن، اور سروں پر صافے پہنی ہوئی تھیں، جب کہ عورتوں نے خود کو اوپر سے نیچے جلباب کے تہوں میں ڈھکا ہوا تھا، یا کچھ نے ڈھیلے ڈھالے کرتا شلوار

انگیزشِ عدل

میں، جن پر کوئی کام نہ تھا۔

اسی بھیڑ میں ہم اس کا تعاقب کرتے ہیں، جو ہرے کرتا شلوار میں ملبوس تھی۔ سر پر اس کے دوپٹہ اسکارف کی صورت بندھا ہوا تھا۔ اس کے کمر تک آتے بھورے بال، فی الوقت ایک جوڑے میں قید تھے۔ سیاہ آنکھوں میں سرد مہری تھی اور دبا دبا سا تحکم بھی۔ وہ نہایت تیز قدم بڑھا رہی تھی۔ نہیں نہیں، وہ عجلت میں نہیں تھی، وہ فطرتاً تیز چلتی تھی۔

وہ جہاں سے گزرتی، وہاں مرد حضرات اپنے سروں کو خم کرتے اسے سلام پیش کرتے۔

وہ آنکھوں میں رعب جمائے، دبی دبی آواز میں ان کے سلام کا جواب دیتی۔ بلاشبہ، وہ نہ صرف اعلیٰ شخصیت کی حامل تھی، بلکہ ایک اونچے رتبے والی عورت تھی۔

بالآخر، اس کی منزل آگئی تھی۔

وہ ایک منزلہ عمارت پر مشتمل بیکری تھی۔ اس نے چبوترا چڑھا اور لکڑی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

باہر لکڑی کی تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا ہوا تھا:

"چمنِ گلاب

جہاں خوشیاں بانٹی جاتی ہیں۔"

......☆☆☆......

یہ ایک دو منزلہ سرائے کا منظر ہے، جس نے نہ جانے کتنے سیاحوں کو پناہ دی ہوئی تھی۔

پہلی منزل میں ایک مختصر چائے خانہ تھا۔ بالائی منزل میں راہداری تھی جس کے دائیں اور بائیں اطرف، کمرے ہی کمرے تھے۔

ہم اس راہداری کے آخری کمرے کا رُخ کرتے ہیں۔

کمرے میں خراٹوں کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ نرم و ملائم بستر پر سیدھ میں لیٹا، نیند کی وادیوں میں کھویا ہوا تھا۔

کھڑکی سے دھوپ داخل ہو رہی تھی، لیکن خواب چشمی کی حالت میں ہی وہ چہرے پر تکیہ رکھ چکا تھا۔

انگیزشِ عدل

یکبارگی دروازہ بج اٹھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور گہری سانسیں لینے لگا۔ اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔

”مسٹر البرٹ ونسٹن۔ نو بج چکے ہیں۔ اٹھ جایئے۔“ شائستہ مردانہ آواز، اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس آواز کی پیروی، قدموں کی چاپ نے کی جو کہ رفتہ رفتہ مدہم پڑ رہی تھی۔

اپنی سانسیں اور حواس بحال کرتے اس نے سائیڈ ٹیبل سے تانبے کا گلاس اٹھایا جس میں پانی بھرا ہوا تھا اور گھٹا گھٹ پی گیا۔ ایک تو امرتسر کی بے رحم گرمی کی اسے اب تک عادت نہ ہوئی تھی۔

وہ سر جھٹکتے کھڑا ہوا اور غسل خانے جانے لگا۔ اسے خود کو ایک مصروف دن کے لیے تیار کرنا تھا۔

......☆☆☆......

”لڑکیوں!“ بیکری میں داخل ہوتے ہی اس نے استحکام سے دو تالیاں پیٹ کر، اپنی گرجدار آواز میں کہا۔

ملازمائیں یک دم چونک اٹھیں اور مرعوب ہوتے اسے دیکھنے لگیں۔ سب کے چہروں پر خوف کی رمق تھی جیسے وہ کچھ غلط کر بیٹھی ہوں۔

اس نے بائیں جانب نظر دوڑائی۔ یکبارگی سیاہ آنکھوں میں تپش ابھری۔

”ہمیں یہ میز خالی کیوں دکھائی دے رہی ہے؟ کہاں ہیں کیکس، بسکٹس؟“ وہ انگشتِ شہادت سے خالی میز کی جانب اشارہ کرتے، سختی سی بولی۔

ملازمائیں ایک دوسرے کو چور نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ مگر کسی کی اس سے نظریں ملانے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ سیاہ آنکھیں تھیں ہی اتنی متوحش۔

دفعتاً ایک بھاری بھرکم جسامت کی ملازمہ اس کی جانب بڑھی۔ اس کے چہرے پر ندامت کا سایہ تھا۔ چمنِ گلاب کی مدبر مالکن کے مقابل کھڑے ہو کر، گردن جھکا لی۔

”چابی میرے پاس تھی، یاسمین صاحبہ۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ دراصل، میری آنکھ دیر سے کھلی۔“

یاسمین کی آنکھوں میں ایسا تاثر تھا، جیسے پلک جھپکتے ہی وہ اس لڑکی کو کھا جائے گی۔ شاید وہ اشتعال میں تھی، یا شاید آنکھوں کا یہ تاثر اس کی تیز چال کی طرح ہی فطری تھا۔

انگیزشِ عدل

"خطا کتنی بھی بڑی کیوں نہ ہو، روشی۔ آئندہ معافی مانگتے وقت اپنی گردن جھکنے نہ دینا۔" لہجہ سرد، دھیما اور رعب دار تھا۔

روشی نامی وہ بھاری بھرکم ملازمہ نے کرنٹ کھانے والے انداز میں اپنی گردن اٹھائی۔ چہرے پر ندامت شدید ہوئی۔ اغلاط کی فہرست بڑھتی جو جارہی تھی۔

"ہم مسلمان ہیں۔ خدا کے علاوہ کسی ذات کے آگے گردن نہیں جھکاتے۔" کہتے کہتے، شان سے اس کی گردن اکڑ گئی۔ اس نے کہنی پر لٹکا پرس روشی کے حوالے کیا۔ سب چھوڑ چھاڑ کر باورچی خانے کی جانب بڑھ گئی۔

جب کہ روشی جامد سی کھڑی رہ گئی۔ تذلیل کے احساس نے چہرا سُرخ کر دیا تھا۔

......☆☆☆......

وہ آئینے کے سامنے کھڑا، اپنے گیلے بالوں پر کنگھی پھیر رہا تھا۔ اس نے سفید شرٹ کے اوپر بھورا کوٹ پہن رکھا تھا۔ بالوں کی سیٹنگ سے مطمئن ہو کر اس نے ایک نظر خود کو دیکھا۔ کنگھی جگہ پر رکھ کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

وہ دروازہ کھولنے ہی لگا تھا کہ اس کی نگاہ زمین بوس بھورے لفافے پر پڑی۔ اسے دیکھتے ہی وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ شہد رنگ آنکھیں شناسائی کے احساس سے چمک اٹھیں۔ اس نے جھک کر لفافہ اٹھایا۔ لفافے کے اندر سے ایک خط برآمد ہوا۔ وہ اس کے والد، فرینک ونسٹن کی طرف سے تھا۔ اس نے بلا تاخیر وہ خط پڑھ ڈالا۔

"ڈیئر البرٹ۔

بات کا آغاز کرنے سے قبل میں معافی طلب کرنا چاہوں گا، کیونکہ پچھلے ہفتے میں ہندوستان نہیں آسکا۔ میری مصروفیات نے مجھے اجازت نہیں دی۔ دل بے چین ہے، مگر بعض چیزیں اپنی ذمہ داریوں کے عوض، قربان کرنی پڑتی ہیں۔

میں اور مسز ونسٹن امید کرتے ہیں کہ تم خیریت سے ہوگے اور اپنے اس سفر سے لطف اٹھا رہے ہوگے۔ پچھلے دو سال سے تمھارے دیدار کو ہماری آنکھیں ترس گئی ہیں، لیکن یہ جان کر کہ تم خوش ہو، ہم اپنے دل کو مطمئن کر لیتے

ہیں۔ ویسے بھی دنیا گھومنے کا شوق کس مرد کو نہیں ہوتا؟ اور ہندوستان جیسے خوبصورت دیس میں کس کا دل نہیں لگ سکتا؟

آہ! ہندوستان کی زمین۔ جب یہ زمین یاد آتی ہے تو دل میں ایک پر مسرت احساس رونما ہو جاتا ہے۔ بڑی محبت ہے اس سرزمین سے مجھے۔ یہ زمین ویسے تو دنیا کا ہی ایک حصہ ہے، لیکن اس میں ایک پورا جہاں آباد ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ہی زمین پر اس قدر مختلف رنگوں، روایتوں اور مذاہب کے لوگ کیسے اکھٹا ہیں۔

شاید ہندوستان کی زمین سے یہ بے نام محبت، تمھیں مجھ سے وراثت میں ملی ہے۔

اب ہم اگلے ماہ برطانیہ میں تمھارے منتظر ہوں گے۔ خیر وعافیت سے لوٹنا اور ہندوستانی سوغات ساتھ ضرور لانا۔

خداوند تمھیں اپنی امان میں رکھے۔"

خط پڑھ کر اس کے اندر تروتازگی سرائیت کر گئی۔ قلب مطمئن ہوا۔ انسان زندگی کے جس مقام پر بھی ہو، دنیا کے کسی کونے میں مقیم کیوں نہ ہو جائے، اس کے دل کا ایک گوشہ کہیں نہ کہیں، والدین کی محبت کو ترسا ہوا ضرور ہوتا ہے، اس بات سے چاہے وہ نفی کیونکر نہ کرتا رہے۔

خط ٹیبل پر رکھتے، وہ کمرے سے باہر نکلا اور نیچے اترا۔ باہر کے رستے تک وہ جیاخانے کے عملے کے ایک ایک فرد کو مسکرا کر سلام کرتا۔ طبیعت سے وہ کافی خوش اخلاق و ملنسار معلوم ہوتا تھا۔

"اور البرٹ صاحب، کہاں چلی سواری؟" کاؤنٹر پر کھڑا عبدالمجید اونچی آواز میں بولا۔

سفید مرد مسکرایا۔ مڑ کر لکڑی کے بنے کاؤنٹر کو پہنچا۔

"چمنِ گلاب!" شہد رنگ آنکھیں پر جوش تھیں۔ مسکراہٹ ہنوز برقرار رہی۔

"سنبھل کر جایئے گا۔ چمنِ گلاب ایک دفعہ چلے گئے تو بار بار جانے کا جی چاہے گا۔" مقابل نے اس کے جوش و خروش کا مقابلہ کرتے، ہاتھ ہلا ہلا کر کہا۔

البرٹ زیرِ لب ہنس دیا۔ گردن جھکائی۔ اپنی ہیٹ کو ہاتھ سے ذرا سا اٹھاتے اس نے اپنے سر کو خم دیا۔ یہ اس کا

الوداع کہنے کا انداز تھا۔

عبدالمجید نے بھی جواباً سر کو خم دیا۔

باہر آ کر اپنی سائیکل پر سوار ہوا۔ اور پھر وہ بھورے بالوں والا مسافر شہر امرتسر کی سیر کے لیے نکل پڑا۔

یہی تو اس کا کام تھا!

اور البرٹ ونسٹن کو اپنے کام سے عشق تھا۔

......☆☆☆......

وہ باورچی خانے میں کھڑی تھی۔ میز پر بڑا سا تھال تھا، جس میں گندمی رنگ کا خمیری آٹا تھا۔ وہ اس آٹے پر مکے ایسے برسا رہی تھی جیسے اپنی ساری بھڑاس نکالنا چاہ رہی ہو۔ ملازمائیں جامد ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ آج کے دن سب نہایت احتیاط سے اپنے کام انجام دے رہے تھے۔ کوئی بھی چمنِ گلاب کی اس تپتی ہوئی مالکن کے قہر کو دعوت دینا نہیں چاہتا تھا۔ معمولی سی کوتاہی بھی جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔

وہ آٹے کے پیڑے بنا بنا کر لوہے کے چکور سانچوں میں بھر رہی تھی۔ بلکہ، بھر نہیں رہی تھی، پٹخ رہی تھی!

"یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں آپ سب؟" وہ نظریں اٹھائے بنا، کام میں مگن ہو کر بولی۔

تمام ملازمائیں ہم آہنگ ہو کر چونک گئیں۔ بنا کچھ کہے ہی شامت جو آنے لگی تھی۔

"ایک تو ویسے بھی آپ کی وجہ سے تاخیر ہو رہی ہے، اور پھر آپ سب یہاں ہاتھ پاؤں بھی نہیں چلا رہیں۔ جائیں جا کر بسکٹس خطائیاں اور کیکس باہر رکھیں۔ کچھ دیر میں گاہکوں کا رش لگ جائے گا۔" اب کی بار آواز بلند ہوئی۔ آنکھوں میں دبا دبا سا طیش ابھرا۔ مگر بولتے وقت اس نے کسی کو بھی نہ دیکھا تھا۔ اگر دیکھ لیتی تو بلاشبہ، ملازماؤں نے مٹی کا ڈھیر بن جانا تھا۔

ملازمائیں ڈانٹ کھا کر تیز تیز ہاتھ چلانے لگیں، لکڑی کی ٹریز کو خطائیوں اور کیکس سے سجا سجا کر باہر لے جانے لگیں۔

جب کہ سیدہ یاسمین سر جھٹکتے اپنے کام میں مشغول رہی۔

انگیزشِ عدل

......☆☆☆......

وہ چہرے پر مسکراہٹ طاری کیے ان تنگ گلیوں میں اپنی سائکل دوڑا رہا تھا۔ اس گرمی میں بھی وہ روز ایسے ہی بازاروں میں گھومتا تھا اور ہمیشہ کی طرح یہ بازار اس کا دل باغ باغ کر دیتے۔ مسافر کے لیے سفر کی سختیاں بھی تفریح کا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔

وہ دل ہی دل میں خواہش کرتا تھا، کہ کاش یہ رونق یہ چمک دمک برطانیہ میں بھی پائی جاتی!

ہندوستان کو رنگوں کا دیس، بلاوجہ تو نہیں کہا جاتا۔

یہاں لوگوں کی خدوخال رنگین تھی تو ان کے لباس بھی رنگین تھے۔ نہ صرف لباس بلکہ ان کے پکوان اور مٹھائیاں بھی رنگ برنگی تھیں۔ ان کے تہوار بھی رنگین تھے۔ ہندو جن بتوں کو پوجتے تھے وہ تک رنگین ہوتے تھے۔ مندروں سے لے کر، گردواروں سے لر کر مسجدوں تک، ہر عمارت رنگین تھی۔

اسی لیے تو ہندوستان تھا......رنگوں کا دیس۔

اس کی نظر لکڑی کی اس تختی پر پڑی جس پر چمنِ گلاب لکھا ہوا تھا۔ اس نے سائیکل مخصوص مقام پر پارک کی۔ وہ اس گلی سے پہلے کئی مرتبہ گزر چکا تھا، لیکن چمنِ گلاب کا دورہ کرنے کا اتفاق نہ ہوا۔ وجہ یہی تھی کہ اسے میٹھے میں خاص دلچسپی نہ تھی۔

البتہ، آج وہ اس بیکری کی سوغات آزمانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ امرتسر میں قیام کے دوران اس نے چمنِ گلاب کی شان میں اتنے قصیدے سن لیے تھے، کہ اب وہ آپ ہی ان کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

اس نے یہ سن رکھا تھا کہ اس بیکری کی مالکن کوئی امیر بیوہ ہے، جو دل کی نہایت نرم اور صحبت سے شفیق ہے۔

ان ہی سوچوں میں گم اس نے بیکری کا دروازہ کھولا اور ایک قدم اندر بڑھایا۔

بیکری میں صرف دو قدم ہی بڑھائے تھے کہ وہ تھمنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کیے گہری سانس اندر لی۔

ڈبل روٹی، کیکس اور بسکٹس کی خوشبوؤں کا آپس میں خوبصورت امتزاج پیدا ہوا۔ کیا زبردست خوشبو تھی وہ؟

انگیزشِ عدل

اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلیں۔ اب تو اس بیکری کی سوغات آزمانے کے لیے وہ پہلے سے بھی زیادہ پر جوش تھا۔

اس نے نظر اٹھا کر اس بیکری کا ایک مختصر جائزہ لیا۔ بیکری کافی چوڑی اور لمبی تھی۔ بائیں طرف ایک میز تھی جو اختتام تک جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دوجی میز لگائی گئی تھی۔ یوں دونوں میز مل کر "ایل" شیپ بناتی تھیں۔ ان میزوں پر، ترتیب سے خطائیوں اور کیکس کی ٹریز سجی ہوئی تھیں۔ دائیں طرف کچھ کرسیاں بھی رکھی گئی تھیں۔ اختتام پر ایک دروازہ بھی تھا جو کہ یقیناً بیکری کے باورچی خانے کو کھلتا تھا۔

چہرے پر نرم صحبت مسکراہٹ سجائے وہ یاسمین کی جانب قدم بڑھانے لگا جو سیدھ میں ہی، میز کے پیچھے کھڑی تھی۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔"

اپنی طرف اس برطانوی مرد کو آتا دیکھ کر وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔ دن کا آغاز وہ ہمیشہ بسم اللہ سے کرتی تھی۔

اس کے سامنے پہنچ کر، البرٹ نے ادب سے اپنے سر کو خم دیا۔

"آپ کی بیکری کی سب سے خاص سوغات کون سی ہے؟" لبوں کو مسکراہٹ میں ڈھالتے، وہ شیریں لہجے میں بولا۔

لیکن اس لڑکی کی ان آنکھوں کو دیکھ کر اس کی مسکراہٹ فنا ہوئی۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اسے کچا چبانا چاہتی ہو۔ البرٹ خود ساختہ ہو گیا۔ اسے لگا، جیسے انجانے میں وہ کوئی خطاء ہی کر بیٹھا ہے۔

"آپ ہمارے بسکٹس آزما سکتے ہیں۔" اس کا لہجہ اتنا ہی ٹھنڈا تھا جتنا البرٹ کا گرم۔ آنکھوں میں دبی دبی سی ناپسندیدگی تھی۔

البرٹ کو تو وہ لڑکی نہایت بد اخلاق لگی۔ نہ جانے اس بیکری کی شفیق و ہمدرد مالکن کی کیا مجبوری ہو گی جو اسے کام پر رکھ لیا؟ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"میں دو لینا چاہوں گا۔" اپنی دو انگلیاں بلند کرتے وہ منہ بناتے بولا۔ سارا موڈ پل بھر میں اس مغرور لڑکی نے بگاڑ دیا تھا۔

انگیزشِ عدل

یاسمین نے بھورے لفافے میں دو بسکٹس ڈالے اور اسے تھما دیے۔ وہ قیمت ادا کر کے، ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے کے زاویے بری طرح بگڑ چکے تھے۔ خوشبوؤں سے ہونے والے اس گرمجوش استقبال کا سارا اثر، اس لڑکی کے ناگوار مزاج نے زائل کر دیا تھا۔

کوئی اپنے گاہکوں سے ایسے پیش آتا ہے؟ دل ہی دل میں وہ بس اسے کوستا گیا۔ اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟

بہر حال، اس نے دونوں بسکٹس نکالے۔ پس منظر میں مسلسل گھنٹی کی آواز گونج رہی تھی، یعنی آہستہ آہستہ بیکری میں گاہکوں کا رش بڑھ رہا تھا۔

اس نے خفگی سے سر جھٹکتے بسکٹ منہ میں رکھا۔ ان بسکٹس سے اسے کوئی خاص امید نہ رہی تھی۔

لیکن پھر کچھ غیر متوقع ہوا۔ اس کی آنکھوں میں ارتعاش پیدا ہوا مگر وہ خود ساکت و جامد رہا۔

بسکٹ انتہا سے زیادہ لذیذ تھا!

بسکٹ تھا تو کڑک، لیکن زبان سے ٹکراتے ہی گھل کر اس کے حلق میں اترتا چلا گیا۔ بسکٹ کا ذائقہ زبان پر پھیلتے ہی باقی کا بسکٹ اسے دعوت دینے لگا کہ: آؤ مجھے کھاؤ۔

اور اس دعوت سے وہ بھلا کیسے انکار کرتا؟ پل بھر میں، وہ بسکٹ اس کے پیٹ کی زینت بن گئے تھے۔ بسکٹ کھانے کے بعد البرٹ کو یوں لگا جیسے اس کی زندگی کی ساری خوشیاں ہی ختم ہو گئیں۔

واقعتاً، چمنِ گلاب میں خوشیاں ہی بانٹی جاتی تھیں۔

وہ اپنا کوٹ جھاڑتے کھڑا ہوا۔ پھر اس لڑکی جانب بڑھنے لگا۔ وہاں ایک قطار لگی تھی۔ اسے کچھ لینا تو نہیں تھا لیکن یہ سوچ کر کہ وہ بدمزاج لڑکی کسی بات پر اعتراض ظاہر نہ کرے، وہ قطار میں کھڑا ہو گیا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر کے انتظار کے بعد اس کی باری آ گئی تھی۔

"ہیلو مس۔" وہ خوش اسلوبی سے بولا تھا۔ "مجھے اس بیکری کی مالکن سے ملنا ہے۔ فوراً ملاقات ضروری نہیں،

کسی اور دن ہو جائے میرے لیے کافی ہو گا۔ یا آپ مجھے ان کا پتہ بتا دیں میں ان سے خود جا کر مل آؤں گا۔" کہتے کہتے اس نے ایک چور نظر اس کی آنکھوں میں ڈالی تھی۔ اب بھی اس کی سیاہ آنکھوں میں وہی جارحانہ تاثر تھا جیسے وہ اس کے خون کی پیاسی ہو۔

ان آنکھوں کو دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہ، جنگِ عظیم میں جدید ہتھیاروں کی جگہ اس لڑکی کو لے جانا چاہیے تھا، اس کی یہ آنکھیں پورے کے پورے لشکر تباہ کرنے کی سکت رکھتی تھیں۔

"جی فرمایئے۔" وہ اپنے سرد برفیلے انداز میں بولی تو اسے لگا وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔

"آپ شاید کچھ غلط سمجھ رہی ہیں، مس۔ میں اس بیکری کی مالکن سے ملنا چاہتا ہوں۔" وہ بدستور بولا۔

یاسمین کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

"آپ کو کیا لگتا ہے کہ اس بیکری کی مالکن کون ہو گی؟" اس نے الٹا اسی سے سوال کیا۔

"ہوں گی کوئی میری گرینی کی عمر کی۔" اس لڑکی کے طنز کو نظر انداز کرتے، اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

یاسمین نے اسے دیکھتے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی۔

"پھر ہم آپ کی غفلت کا بلبلہ پھوڑنا چاہیں گے۔ اس بیکری کی مالکن ہم ہیں۔ چمنِ گلاب ہمارا ہے۔" دوٹوک انداز میں البرٹ کے اوپر انکشاف کیا۔

البرٹ کے چہرے کی رنگت زرد پڑی۔ اس نے نامحسوس انداز میں پیر پٹخا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنا کام جاری رکھ سکتے ہیں؟" یاسمین نے اس کے پیچھے لمبی قطار کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بے چارہ بھی سر جھٹکتے وہاں سے چلا گیا۔

چمنِ گلاب کی سوغات کے بارے میں کوئی بھی غلط نہ تھا، ہاں اس کی مالکن کے بارے میں سب ہی غلط تھے۔ یقیناً وہ لوگ اسے ہمدرد اور شفیق طنزاً کہتے ہوں گے۔

انگیزشِ عدل

اپنی سائیکل کی نشست پر براجمان ہوتے وہ تلخ نظروں سے، لکڑی کی اس تختی کو دیکھنے لگا۔

”میں نے تو سنا تھا کہ مسلمان عورتیں دبی دبائی ہوتی ہیں۔“ وہ زیرلب بڑبڑایا۔

کبھی واپس نہ آنے کا فیصلہ کر کے وہ وہاں سے چلا گیا۔

......☆☆☆......

صبح کا سورج باسی ہو رہا تھا۔ دوپہر کے وقت، کڑکتی دھوپ امرتسر کی گلیوں کو سینکنے میں کوئی کثر نہ چھوڑ رہی تھی۔

اسی دوپہر، ہم تھانے کا رُخ کرتے ہیں۔ جہاں چیف پولیس افسر، مسٹر لوئیس، سربراہی کرسی پر براجمان تھے۔ ان کی آنکھوں میں برہمی تھی اور چہرے پر تناؤ تھا۔ ان کے سامنے، میز پر ایک سفید پامفلیٹ دھرا ہوا تھا۔

ان کے مقابل، فاصلے پر ایک نوجوان کھڑا تھا۔ سر پر اس نے خاکی رنگ کی ٹوپی پہنی تھی، جس کی سرحدوں کو پار کر کے، شہد رنگ بال ظاہر ہو رہے تھے۔ اس کی وردی پر ایک تختی تھی، جس پر اس کا نام درج تھا:

”جیمس اینڈرسن“

جھکی گردن، اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ فی الوقت وہ اپنے باس سے ڈانٹ وصول کر رہا ہے۔ ایک تو یہ گرمی اور پھر یہ ڈانٹ، اندر ہی اندر وہ کافی اکتایا ہوا تھا، مگر یہ باس کا ڈر تھا شاید جو اس نے اپنے چہرے کو پرسکون ظاہر کیا ہوا تھا۔

”تو سنو مسٹر جیمس!“ وہ انگریزی میں اس سے مخاطب ہوئے۔

لوئیس نے جارحانہ انداز میں پرچہ اٹھایا اور اسے پڑھنا شروع کیا۔

”ہم تمام مسلمان، ہندوؤں اور سکھوں کو دعوت دیتے ہیں کہ برطانوی اشیاء کے اس بائیکاٹ میں ہمارا ساتھ دیں۔ خلافتِ عثمانیہ کو توڑنے کے ان منصوبوں کو ہم لوگ کسی صورت کامیاب ہونے نہیں دے سکتے۔ وہ جنگوں میں لے جا کر ہمارے ہی لوگوں کو خون ریزی کا نشانہ بناتے ہیں، پھر کیسے ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ سکتے ہیں؟ اپنے گھروں سے نکلو، برٹش راج کے خلاف آواز اٹھاؤ۔ تمھاری آواز تمھارا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔“

انگیزشِ عدل

ایک وقفہ لے کر انھوں نے غصیلی نگاہ جیمس پر گاڑی، گویا یہ ساری باتیں اس نے لکھی ہوں۔

"خلافت زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد۔ برٹش راج مردہ باد۔" چبا چبا کر کہتے پامفلیٹ میز پر پٹخ دیا۔

ایک تو گرمی میں پہلے ہی جسم جھلس رہا تھا پھر اس ڈانٹ نے جسم کا درجہ حرارت مزید بڑھا ڈالا۔ سفید پیشانی پر پسینے کی بوندیں جھلکیں۔

"تم نے ہی تو کہا تھا کہ تمام پریس بند ہو گئے ہیں، جیمس؟ مجھے جواب چاہیے۔ سب بند ہو جانے کے باوجود یہ پامفلیٹ بازاروں میں کیا کر رہا تھا؟ کیوں اب تک اس طرح کے پامفلیٹس بازاروں میں بٹ رہے ہیں؟ کیا تمھارے پاس اس نااہلی کی وضاحت موجود ہے؟" وہ بھڑک اٹھے۔ دونوں ہاتھ میز پر دے مارے۔ میز پر پڑے کاغذات اور فائلیں تھرتھرائیں۔

جیمس نے بالآخر سر اٹھایا۔ کھڑکی سے آتی دھوپ اس کے چہرے پر پڑی تو بھوری آنکھیں شہد رنگ کی دکھائی دیں۔ شہد رنگ بال، سنہرے ظاہر ہو رہے تھے۔ تر پیشانی اور گردن چمک اٹھی۔

"سر، تمام پریس بند ہیں۔ نہ صرف باغیوں، اخبار نویسوں کو گرفتار کیا گیا تھا، بلکہ انھیں بھی سزا دی گئی تھی جو ان باغیوں کے ہمدرد تھے۔ مگر۔ میرے اندازے کے مطابق پریس بند ہونے کے بعد، یہ ہندوستانی دوسرے ذرائع استعمال کرنے لگے ہیں۔" اس نے سپاٹ آواز میں احوال گوش گزار کیا۔

لوئیس کے ماتھے کی تیوری برقرار رہی۔ سرکاری غلام کے لیے ریاست کا خوف سب سے بڑا خوف ہوتا ہے۔

"جیمس۔ ہم، جلیاں والا باغ کے سانحے کو نہیں دہرا سکتے۔ اب اگر کوئی چیز خراب ہوئی، تو اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔ find these rascals۔" انداز پہلے سے قدرے ٹھنڈا ہوا۔

"یس سر۔ میں پوری کوشش کروں گا۔ دنگا کرنے والے پکڑے جائیں گے۔" اس کی آنکھوں میں پر اعتمادی تھی۔

"زبانی دعوہ کافی نہیں ہے، جیمس۔" وہ اپنی وردی، جس پر نہ جانے کتنے بیجز اور ستارے چپکے تھے، جھاڑتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ "ان دعوؤں کو سچ ثابت کرنا ہو گا تمھیں۔" ایک آخری اچٹتی نگاہ سے اس پسینے میں شرابور

افسر کو دیکھا۔ اور پھر اپنی راہ چل دیے۔

ان کے جاتے ہیں اس نے لبوں کی سمت گہری سانس خارج کی۔ بھوری آنکھوں میں پر سوچ تاثر قائم تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پامفلیٹ اٹھایا اور استفہامیہ نگاہوں سے اس کی جانچ پڑتال کرنے لگا۔

یکبارگی اس کی نظر ایک داغ پر پڑی جس کا حجم بس ایک نقطے جتنا تھا۔ اس نے زبان سے اس داغ کو چاٹا۔ مٹھاس اس کے حلق میں اتری۔ چہرے کا پر سوچ تناؤ ڈھیلا ہوا۔

"شیرا؟" وہ الجھ کر خود کلامی کرنے لگا۔

اپنے نتھنوں کو قریب کر کے وہ اس کاغذ کو سونگھنے لگا۔ ایک شناسا مہک اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔

"لگتا ہے، دنگا کرنے والوں کو میٹھے کا ضرورت سے زیادہ شوق ہے۔" شاطر مسکراہٹ میں لبوں کو ڈھالتے، وہ آپ ہی بڑبڑایا۔

کیا اس کے دماغ میں کوئی گھنٹی بج چکی تھی؟

......☆☆☆......

رفتہ رفتہ سورج ڈھلتا گیا۔ دن کا اجالا پسپائی اختیار کرنے لگا، اور ایک وقت آیا کہ سورج پھر سے زمین کی کوکھ میں کہیں گم ہو گیا۔ رات کی تاریکی نے آسمان پر چادر پھیلائی اور ہلال آسمان پر دمکنے لگا۔ نیم ٹھنڈی ہوا، کھلی کھڑکی کے ذریعے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ دن بھر تپتی ہوئی گلیوں میں سیر سپاٹوں کے بعد یہ ٹھنڈی ہوائیں کسی انعام سے کم نہ لگتی تھیں۔

وہ اپنی اسٹڈی ٹیبل پر کاغذ پھیلائے بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں قلم تھا۔ اپنی کرسی سے ٹیک لگائے گردن موڑ کر وہ آسمان پر چمکتے اس خوبصورت چاند کو مبہوت سا ہو کر تک رہا تھا۔ یکدم اس نے جھٹکا کھایا اور کاغذ کی طرف متوجہ ہوا۔

جی ہاں، البرٹ ونسٹن ایک لکھاری تھا۔ کوئی معمولی لکھاری نہیں، بلکہ اس کا شمار برطانیہ کے مشہور ترین فکشن نگاروں میں ہوتا تھا۔ فی الوقت، وہ اپنے ہندوستان کے سفرنامے پر کام کر رہا تھا۔ یہ اس کی پہلی نان فکشن کاوش تھی اس لیے وہ اس پر جوش و استقلال کے ساتھ کام کر رہا تھا۔

انگیزشِ عدل

اس جہاں میں اسے تین شے عزیز تھیں، لکھائی، کھانا پینا اور ہندوستان!

تو پھر کیا تھا، ایک دن اپنے کاغذات کے پلندے اٹھائے اور ہندوستان بھاگا بھاگا آگیا۔ دو سالوں میں وہ ہندوستان کا صوبہ صوبہ گھوم چکا تھا۔ اس کی توجہ کا مرکز، ہندوستان کی ثقافت و ریت روایات تھیں اور یہاں کے منفرد اور لذیذ پکوان بھی، جنہوں نے اس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔

اب وہ پنجاب میں تھا اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ امرتسر اس کی آخری منزل تھی، کیونکہ اس کے بعد اس نے برطانیہ واپس چلے جانا تھا۔

لکھنے سے قبل اس نے ایک سانس خارج کی۔ دماغ میں الفاظ اجاگر ہونے لگے تھے۔ البرٹ نے کاغذ کے صفحے پر قلم کی نوک رکھتے لکھنا شروع کیا۔

......☆☆☆......

وہ تنگ گلی میں تنہا تھی، جس کے دائیں اور بائیں اطرف عمارتیں ہی عمارتیں تھیں۔ اس گلی میں، کچھ ہی دوری پر اس کے گھر کی دو منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ شاید وہ کسی گہرے خیال میں غرق تھی، کیونکہ اپنی فطرت کے برعکس وہ سست روی سے قدم بڑھا رہی تھی۔

جوں ہی اس کی نظر ایک بچے پر پڑی جو اس کے گھر کے سامنے گردن جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ رک کر اس بچے کو دیکھنے لگی۔ کسی سوچ کے تحت، وہ پھر سے چلنا شروع ہوئی۔

اس بچے نے اپنی طرف بڑھتے ان قدموں کو سنا۔ اس نے اپنا چہرا اٹھایا۔

وہ چہرا یاسمین کے لیے شناسا تھا۔ وہ بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ البتہ چہرا اب بھی پتھریلا تھا۔

"سریش!" اس نے زیرِ لب اس بچے کو پکارا۔

......☆☆☆......

قندیل کی زرد روشنی میں اس کی میز نمایاں ہو رہی تھی۔

اس کا قلم کاغذ پر روانی سے چل رہا تھا۔ وہ پوری طرح سے دنیا سے مافیہا ہو کر لکھ رہا تھا۔ روح سرشار تھی۔

انگیزشِ عدل

"آج میرا امرتسر کی مشہور بیکری چمنِ گلاب جانے کا اتفاق ہوا۔

ویسے تو اس کے بارے میں پہلے لاتعداد مرتبہ سن چکا ہوں، لیکن یہ سوچ کر وہاں کا دورانہ کیا کہ مجھے میٹھے کا اتنا شوق نہیں۔ میں پورا ہندوستان گھوما ہوں، اور ان کی مٹھائیوں سے ایک شکوہ رہا ہے کہ ان میں مٹھاس ضرورت سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ یوں کہ کھانے کے بعد حلق میں نہ کڑواہٹ گھل جاتی ہے جو کہ کسی ہمزاد کی طرح پورے دن ساتھ رہتی ہے۔ تاہم میں میٹھا کھانے سے گریز کرتا ہوں۔

لیکن شاید وہ نام میرے دل کو بھایا تھا: "چمنِ گلاب"۔ اور بس میں نے وہاں کی سوغات آزمانے کا فیصلہ کیا۔ کھانے کے معاملے میں، میں ویسے بھی دماغ سے زیادہ دل کی سننے کا عادی ہوں۔"

......☆☆☆......

اس گلی میں خاموشی رقصاں تھی۔

سریش نامی اس بچے کی نم آنکھوں کا ٹکراؤ یاسمین کی ان سرد و سیاہ آنکھوں سے ہوا۔ وہ سست روی سے گھٹنوں کے بل بیٹھی اور نرمی سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ چھوٹا بچا اس کی موجودگی میں پر سکون محسوس کر رہا تھا، شاید اس لیے کہ وہ یاسمین سے مانوس تھا۔ اپنے اجڑے اجڑے وقتوں میں شاید انسان کو بس ایک مانوس لمس کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔

"گھر میں سب خیریت تو ہے؟" آواز قدرے نرم تھی لیکن چہرا اب بھی پتھرایا ہوا تھا۔ وہ اب اس کے گہرے سانولے گال سہلانے لگی۔

"آج میرا جنم دن تھا، آپا۔" ایک بار پھر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ رونے لگا۔

"پتاجی کی بہت کمی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ مجھے ہر سال میرے جنم دن پر گھمانے لے کر جاتے تھے۔ ہمارے گھر میں خوشی کا سماں ہوتا تھا۔" وہ اداس سا مسکرایا۔ آنسو اس کے لبوں سے پھسلے۔

"وہ کہتے تھے میں ایک چمتکار ہوں۔ جب انھوں نے اولاد کی امید کھو دی تھی تب میرا جنم ہوا۔ لیکن اب۔ اب وہ نہیں رہے آپا۔ میرا گھر میں دم گھٹ رہا تھا اور میں بھاگ گیا۔" اس نے بات ختم کی

بھورے بالوں والی لڑکی نے اپنی انگلیوں سے اس کے چہرے پر پھیلی نمی رگڑی۔

......☆☆☆......

”بہر حال میں وہاں کی نگراں سے جاملا۔ مجھے اس کی شکاری آنکھیں اب بھی وحشت ذدہ کر رہی ہیں۔ جیسے کسی کے خون کی پیاسی ہوں۔ اور پھر اس کی زبان تو اس قدر کڑوی تھی کہ کوئی حد نہیں۔ ایسا نہیں تھا کہ میں نے کوئی بد تمیزی کی تھی۔ لیکن پھر بھی اس کے مزاج میں کج خلقی کا عنصر قائم تھا۔

بہت ہی بُرے دل کے ساتھ میں نے دو بسکٹ لے ہی لیے۔ میری ان سے خاص امیدیں وابستہ نہیں تھیں۔ لیکن پھر جب میں نے انھیں چکھا تو بس! ایسا محسوس ہوا جیسے میری روح جنتوں سے گزر کر دنیا میں لوٹی ہو۔

وہ بسکٹ ہر طرح سے کامل تھے۔ متوازن مقدار میں موجود مٹھاس البتہ ہلکے سے نمکین بھی تھے۔ ان میں کافی کی مختصر کڑواہٹ تھی اور ونیلا کی تازگی بھی۔ بسکٹ میں شامل کیے گئے تمام اجزاء کی مناسب مقدار میں موجودگی اس بات کی ضمانت تھی کہ انھیں بنانے والا اپنے کام میں مہارت رکھتا ہے اور شاید اسے سالوں کا تجربہ بھی حاصل ہے۔ میں نے کئی اقسام کے بسکٹ کھائے ہیں، لیکن ان جیسا آج تک نہیں کھایا۔“

......☆☆☆......

ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس گلی سے گزرا تو یاسمین کے ماتھے پر بکھری آوارہ لٹیں جھول اٹھیں۔ گھروں کے باہر جلتی شموع اور دیوں کے بدولت وہ گلی زرد روشنیوں میں نہائی ہوئی تھی۔ ہوا کے اس شور کے سوا وہاں صرف خاموشی تھی۔ سگوار خاموشی۔ دردناک خاموشی۔

اس نے اپنے پرس سے ایک بھورا تھیلا نکالا اور اس چھوٹے بچے کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”سالگرہ مبارک سریش۔“ وہ مسکرائی، لیکن نہ اس مسکراہٹ میں خوشی تھی نہ غم، یوں جیسے وہ بے مقصد ہو۔

سریش نے الجھن ذدہ نگاہوں سے اس تھیلے کے اندر جھانکا۔ اندر کا سامان دیکھ کر وہ چونک گیا اور مشکور ہو کر یاسمین کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ وہ تیزی سے یاسمین سے لپٹ گیا اور ایک بار پھر سے رونے لگا۔ اس نے اسے کھل کر رونے کی اجازت دی اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتے گئی۔ رونے سے انسانوں کے غم مکمل ہو جاتے ہیں۔ نامکمل

غم مہلک زخموں کے سوا کچھ نہیں دیتے۔

اس بچے کو اپنے آغوش میں سمائی ہوئی یاسمین کے گندمی چہرے پر شمع دان سے پھوٹتی ہوئی زرد روشنی نچھاور ہو رہی تھی۔ بلاشبہ، اس کا چہرا اب تک پتھرایا ہوا تھا۔

......☆☆☆......

"ان کو کھانے کے بعد مجھے اس بیکری کی مالکن سے ملنا کا اشتیاق ہوا۔ کیا ہے کہ اس بیکری کی مالکن کا پہلے بھی ذکر سن چکا ہوں۔ لوگ تو کہتے تھے کہ، وہ کوئی بہت ہی شفیق اور ہمدرد خاتون ہیں۔

لیکن نہیں، نہیں۔ اس بیکری کی مالکن وہی تھی۔ وہی لڑکی جس نے میرا انتہائی "گرم جوش" استقبال کیا۔

خدارا اگر وہ شفیق اور ہمدرد ہے تو میں کسی ظالم سے ملنا نہیں چاہوں گا۔ میری تو بس ہو گئی تھی۔ میں نے اسی وقت خود سے عہد کیا کہ آئندہ وہاں نہیں جاؤں گا۔

لیکن میں خود اپنی فطرت سے باخبر ہوں اور یہ بات جانتا ہوں کہ کل اس بیکری کا پہلا گاہک میں خود ہوں گا۔

میں جانتا ہوں میرا یہ دل مجھے بہلائے گا، پھسلائے گا، مجھ سے کہے گا کہ البرٹ، تمھیں تو کھانے پینے سے غرض ہونا چاہیے نا؟ اس لڑکی کے برتاؤ سے تمھارا کیا لینا دینا۔"

......☆☆☆......

انسان میں انسانیت نہ ہو تو وہ انسان کس کام کا؟ انسانیت تو نام ہے ہمدردی کا۔ محبت کا۔ یکجہتی کا۔ وہ سرد تھی، کھڑوس بھی تھی، بدمزاج بھی تھا۔ مگر وہ انسان تھی!

"آپ ایسے نہ روئیں سریش۔ آپ کی والدہ کو آپ کی ضرورت ہے۔ اگر آپ ہی یوں ڈھے جائیں گے تو انھیں کون سنبھالے گا؟ کبھی سوچا ہے؟" وہ اسے خود سے جدا کرتے نرمی سے بولی۔

سریش نے گیلی سانس اندر کھینچتے خود کو رونے سے روکا۔

"کیا کروں آپا؟ آپ ہی بتائیں۔ پتا جی کو ناحق مارا تھا۔ کیا پچھلے سال جو ہزاروں لوگ مرے تھے کیا انھیں مرنا چاہیے تھا؟ ہم کب تک یوں ہی بے بس اور قید رہیں گے؟ ان لوگوں کے ہاتھوں دبتے رہیں گے؟ کیا اس سانحے کے

بعد کچھ بھی پہلے جیسا ہو سکتا ہے؟"

اب کی بار تو یاسمین کے دل کو ایسی ضرب لگی کہ بمشکل اس نے آنسوؤں کو آنکھوں میں چھلکنے سے روکا۔ وہ سچ ہی تو کہتا تھا، پچھلے سال کی انہونی آخر کوئی کیسے بھلا سکتا تھا؟ وہ ان سب کو بڑے گہرے زخم دے گئی تھی۔

زخم، جو مہلک ثابت ہو رہے تھے۔

جو بار بار رگڑ کھاتے اور تکلیف کا سبب بنتے تھے۔

جو بار بار نئے سرے سے خون بہاتے تھے۔

"ظلم ہوا تھا، سریش۔ ہم سب پر۔ امرتسر کی ہر گلی میں سریش ہے، جسے آپ ہی کا غم لاحق ہے۔" سیاہ آنکھوں میں تپش ابھری۔ اس نے نرمی سے اس بچے کی ٹھوڑی تھامی۔

"یہ نفرت جو آپ کے اندر پل رہی ہے، قیمتی ہے۔ اس نفرت کی حفاظت کرنا ضروری ہے، اور اس کا استعمال کرنا فرض ہے۔ یاد رہے، یہی نفرت ایک دن ہمیں غلامی اور قید سے نجات دلوائے گی!" وہ فرطِ جذبات سے بولی۔

چھوٹا بچا پر تپش نگاہیں لیے سر اوپر نیچے ہلاتا گیا۔

"یقین جانیں۔ ہم آزاد ہوں گے۔ ضرور آزاد ہوں گے۔" پھر جیسے اس کے باطن نے اس کی جذباتی کیفیت کی نفی ہوئی۔ وہ ایک بار پھر بلا تاثر ہوئی۔

"اپنا سر اٹھائیں، اور گھر جائیں۔ آپ کی والدہ پریشان ہوں گی۔" وہ بدستور بے مقصد سا مسکرائی۔

سریش نے سر اوپر نیچے ہلایا۔ اپنی آنکھیں رگڑتے وہ کھڑا ہوا اور اپنی راہ چلنے لگا۔

وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوا تو اس کے کندھے شل ہو گئے۔ آنکھوں میں بے بسی اور افسردگی کی لہر ابھری۔ اس کی روح کو ایک شناسا سے کرب نے جکڑ لیا۔ وہ سرد، ہاری ہوئی سانس خارج کرتے، کھڑی ہوئی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی ساری توانائی نچڑ گئی ہو۔ اس نے گردن موڑ کر گھر کے باہر کیاری کو دیکھا۔ اس پر سفید خوشبودار یاسمین کے پھول لگے ہوئے تھے۔ وہ محویت سے انھیں کچھ دیر تکتے گئی۔

اپنی گردن کا رخ موڑ کر آنکھیں بند کیں۔ رنج کو اپنے وجود کی اتھاہ گہرائیوں میں اتارا۔

انگیزشِ عدل

بعض اوقات دوسروں کی انہونیاں ہماری اپنی انہونیوں کے قبرستانوں میں سے گڑے مردے اکھاڑ دیتی ہیں۔

......☆☆☆......

”نہ جانے کیوں میرا دماغ اب بھی ان آنکھوں میں اٹکا ہوا ہے۔ مجھے یہی گمان رہا ہے کہ میں آنکھوں کو پڑھنے کا ہنر جانتا ہوں، لیکن ان آنکھوں نے مجھے غلط ثابت کیا۔ ان آنکھوں میں سفاکی کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ لیکن کیا؟ کچھ تھا جو وہ آنکھیں چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ تکلیف؟ محرومی؟ بے بسی؟ یا شاید تینوں؟

وہ سیاہ آنکھیں نہایت گہری تھیں اور اتنی گہرائی میں اترنا شاید میری استطاعت میں نہیں تھا۔

اور یوں ایک دلچسپ دن کا اختتام ہوا۔ ان بسکٹ کا ذائقہ اب بھی میری زبان پر موجود ہے۔ اب آگے دیکھتے ہیں کہ چمنِ گلاب کی سوغات ان بسکٹس جتنی لذیذ ثابت ہوتی ہیں کہ نہیں۔“

ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ رفتہ رفتہ وہ دنیا میں واپس آنے لگا۔ دن بھر کی تکان اتر چکی تھی۔

......☆☆☆......

اس نے گھر کی ویرانی میں قدم رکھا، جس کی فضا اسے ثقیل محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بمشکل اپنے آپ کو صوفے تک گھسیٹا۔

صوفے پر بیٹھ کر اس نے میز پر پڑا لالٹین جلایا۔ زرد روشنی پورے کمرے میں پھیلی۔

گھر میں اداسی کا بسیرہ تھا۔ کچھ دیر وہ اس جلتے لالٹین کو دیکھتی گئی۔ اس کی آنکھیں لرزیں۔ دل ڈوب کر ابھرا اور کسی آبگینے کی طرح ٹوٹ گیا۔

چکنا چور۔

کرچی کرچی۔

اور یہ کرچیاں نہ جانے روح کو کتنے نئے زخم دے گئیں۔

اس کا وجود شل ہو کر صوفے پر ڈھے گیا۔ روح، اس لالٹین کی مانند جلنے لگی۔

اس کی وہ بلا تاثر آنکھیں سرد نہ رہی تھیں، بلکہ وہ کوئی گہرا غم منا رہی تھیں۔ ان کے پردوں پر بے بسی تھی،

لاچار گی تھی۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے اور اس کے گالوں پر سے اپنی راہ بناتے، صوفے پر جذب ہو گئے۔ چھت کو دیکھتے ہوئے، اس کی آنکھوں میں التجائیہ تاثر ابھرا۔

"یااللہ!" بے بسی سے موزوں آواز، جس میں کپکپاہٹ تھی، لرزش تھی۔ کہاں چلی گئی تھی اس کی آواز کی پختگی؟ کوئی کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی یاسمین تھی، چمنِ گلاب کی کٹھور، سنگ دل مالکن؟

"یااللہ ہمارے اوپر رحم کر!" اب اس کی آواز بلند ہوئی اور اس میں تڑپ شامل ہوئی۔

ایک بار پھر اس نے گردن جھکالی۔ سر ہاتھوں میں گرائے، بدستور روتی گئی۔

سرد مہر، سفاک اور سنگ دل یاسمین، جو دنیا کے سامنے کسی تناور چٹان کی طرح تھی، وہ در حقیقت اس قدر حساس تھی کہ ایک بچے کے آنسوؤں نے اس کا ہر زخم خرچ دیا تھا۔

یہ تھی سیدہ یاسمین مجاہد!

......☆☆☆......

انسان کی زندگی شاید تھم سکتی ہے۔ وہ اپنے غموں میں غرق ہو کر خود کو کھو سکتا ہے۔ لڑنے کی ہمت کھو سکتا ہے۔ لیکن یہ دنیا اس کے لیے نہیں تھمتی۔ یہ دنیا اسے مہلت نہیں دیتی۔ وقت گزرتا ہے۔ رات کی تاریکی کا دم گھٹتا ہے۔ سورج نئے سرے سے طلوع ہوتا ہے اور روشنیوں کو جنم دیتا ہے۔

سورج کی کرنیں چمنِ گلاب کی اس عمارت پر جلوہ افروز تھیں۔ البرٹ کی سائیکل، آج بھی عمارت کے باہر کھڑی تھی۔

وہ ایک گول میز کے گرد کرسی پر براجمان، اخبار پڑھنے میں محو تھا، جب کہ ساری ملازمائیں شدید گھبراہٹ میں مبتلا تھیں۔

یکبار گی دروازہ کھلا۔ جہاں تمام خواتین کے چہرے فق ہوئے وہاں البرٹ نے اخبار نیچے کر کے گردن موڑ کر اسے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کی چال پھرتیلی اور رعب دار تھی۔

یاسمین نے پہلے سب کی گھبراہٹ کا جائزہ لیا۔ گندمی ماتھا تفتیش آمیز لکیروں سے بھرا۔ اس نے دائیں جانب

دیکھا۔ میز کو خالی پا کر اس کا خون کھول اٹھا۔ اس کی نظروں نے اب بھاری بھر کم روشی کا تعاقب کیا جو اپنی گردن جھکانے سے بمشکل خود کو روک رہی تھی، البتہ نظریں ملانے کی اب بھی اس میں ہمت نہ تھی۔

"روشی۔" ہموار مگر پر تپش آواز اور تحکمانہ، برفیلہ لہجہ۔ کیا انداز تھے اس لڑکی کے! مضبوط سے مضبوط کلیجوں کو کاٹ دینے کی سکت رکھتے تھے۔

البرٹ کی شہد رنگ آنکھیں غور سے اس لڑکی کو پرکھ رہی تھیں۔ آخر یاسمین اس خطاء پر روشی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنے والی تھی؟ مار ڈالے گی یا بیکری سے نکال دے گی۔ اس کی شکاریوں جیسی وحشی آنکھیں تو کسی افتاد کی خبر سنا رہی تھیں۔

روشی سست سست قدم بڑھاتے یاسمین کے مقابل کھڑی ہو گئی۔ اب بھی اپنی مالکن سے نظریں ملانے کی ہمت نہ ہوئی۔

"تاخیر ہو گئی تھی، یاسمین صاحبہ۔ اب تو معذرت کرتے ہوئے بھی اپنا آپ گرا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔" اس کی آواز میں شفاف ندامت جھلک رہی تھی۔

مگر کیا اس ندامت کا یاسمین کے دل پر کوئی اثرِ خاص ہوا بھی تھا؟ اس کے پتھریلے چہرے سے اندازہ لگانا، ناممکن تھا۔

"آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو۔ زیادہ سے زیادہ ہم تمھیں نکال ہی دیں گے؟ چلو۔" گردن اکڑ کر، ہاتھ پشت پر باندھے۔

بیکری کی تمام ملازمائیں بشمولیت البرٹ اس منظر کو سانسیں تھام کر دیکھ رہی تھیں۔ اب آگے کیا ہو گا، یہ گفتگو کس رُخ جائے گی، کوئی واقف نہ تھا۔ بیکری کا ماحول پر اسرار ہوا چلا تھا۔

روشی نے ہمت مجتمع کرتے اپنی نظریں اٹھائیں۔ اپنے لرزتے دل کو ضبط کے کڑوے گھونٹ پلاتے، یاسمین کی خونخوار آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ وہ آنکھیں جیسے اسے اندر سے کاٹ رہی تھیں۔ ان آنکھوں کو دو پل کے لیے ہی دیکھنا روشی کو دنیا کا مشکل ترین کام لگا۔

"اب تم ہمیں بتاؤ۔ کوئی خاص وجہ ہے اس تاخیر کی؟" وہی سرد انداز۔

روشی کے بولنے سے قبل لب کپکپائے۔ اسے خوف وہراس نے گھیر لیا تھا۔

"میرا بچہ رات میں سونے سے قبل بہت پریشان کرتا ہے جس کے باعث میری نیند پوری نہیں ہوتی اور یوں تاخیر ہو جاتی ہے۔" وہ لرکھڑاتی آواز لیے گویا ہوئی۔

"کتنے بجے سونے جاتی ہو؟" اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ غصے میں تھی یا نہیں۔

"ساڑھے دس بجے۔" آواز پہلے سے قدرے ہموار تھی۔ شاید اب ان نظروں کی عادت ہونے لگی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہہ کر پیچھے کھڑی ملازماؤں پر نظر دوڑائی۔ بالآخر ایک ملازمہ پر اس کی نگاہ رک گئی۔

"عمارہ!" وہ اونچی آواز میں بولی تو عمارہ نامی، دبلی پتلی ملازمہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"تمھارے بچوں کی عمر کیا ہے۔"

"ایک دس کا ہے اور ایک بارہ کا۔" اس کے لہجے میں یاسمین کے لیے احترام تھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے گردن پھر سے روشی کی جانب موڑی، جس کا دل اب بھی برق رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ نہ جانے چمنِ گلاب کی ملکہ اس کے حق میں کیسا فیصلہ سنانے والی تھی؟

"روشی تم چابی عمارہ کے حوالے کر دو۔ اور ہاں' رات میں کھانا جلدی کھا کر ساڑھے دس کی بجائے ساڑھے نو تک بستر پر چلی جایا کرو۔ کم از کم تمھاری نیند تو پوری ہو گی۔ ہمیں پہلے بھی تم کافی مرتبہ انگڑائیاں اور جمائیاں لیتی نظر آئی ہو، جو کہ قابلِ قبول نہیں۔" اس نے استحکام سے کہہ کر روشی کو لاجواب کیا۔

قدم باورچی خانے کی جانب بڑھائے۔ اس کی چال میں شانِ استغنا قائم تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے باورچی خانے کا دروازہ کھل کر بند ہوا اور وہ اس میں گم ہو گئی۔

جہاں ملازماؤں کی سانسیں بحال ہوئیں وہاں البرٹ نے بھی غیر دانستہ طور پر اٹکی سانسیں نکالیں۔ کیسا سحر تھا اس کی شخصیت میں کہ اس کی موجودگی میں ہر کوئی سانسیں لینا بھول جاتا تھا۔

البرٹ نے بظاہر اپنی گردن اخبار میں جھکالی تھی، مگر اب وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس لڑکی کے بارے میں سوچ

رہا تھا۔ ایک بات پر تو اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ لڑکی اندر سے اتنی سنگدل نہ تھی جتنی بظاہر نظر آتی تھی۔

دوسری طرف، بھاری بھر کم روشی کا چہرا سُرخ انگارے کی مانند دہک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں، چمنِ گلاب کی ملکہ کے لیے شدید ناپسندیدگی واضح تھی۔

......☆☆☆......

کیکس، بسکٹس اور بریڈ سے لدی ٹریز کی باورچی خانے سے باہر نکلنے کی دیر تھی کہ وہ خوبصورت و دلفریب مہک بیکری میں بکھرتی چلی گئی۔ ایک پل میں اس برطانوی مرد کو اپنا اسیر بنایا۔

اخبار تہہ کر کے میز پر رکھتے ہوئے، البرٹ نے آنکھیں بند کیں اور اس مہک کو اپنے اندر اتارا۔ یہ خوشبو کسی نشے سے کم نہ تھی۔ ہمیشہ کی طرح، وہ اس کے لیے تروتازگی کا سامان بنی تھی۔

بغیر کسی تاخیر کے، وہ کھڑا ہوا اور اپنے لیے بادام کے کیک کا سلائیس لے آیا۔

وہ جوں کے توں بادام کے کیک کے سلائس کو دیکھتا رہ گیا۔

اس سلائیس کی خوبصورتی دیکھ کر اسے حیرت نے گھیر لیا تھا۔ کیک کی سنہری سطح پر الائچی کے شیرے کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا، جس کی بدولت وہ چمک رہی تھی۔ ادھ کٹے باداموں سے اس پر نقش بنائے گئے تھے۔

کیک اس قدر نرم تھا کہ چمچ سے ہلکی سی ٹکرار کے بعد ہی کسی اعلیٰ معیار کی مکھن کی ٹکیہ کی طرح ٹوٹ گیا۔

البرٹ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ کیک اس کی کافی صبر آزمائی کر گیا تھا۔

بالآخر، کیک کا وہ ٹکرا اس نے اپنے حلق میں اتارا۔ اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے اس کی روح عرش تک پہنچ گئی ہو۔ دماغ میں سکون کی لہر دوڑی۔ سر ہلکا پھلکا ہونے لگا تھا۔

اور یہ وہ وقت تھا جب البرٹ کو یقین آ گیا تھا کہ چمنِ گلاب میں صرف بیکنگ نہیں ہوتی تھی، وہاں جادو ہوتا تھا۔ اور یہاں کی ملازمائیں کسی ساحرہ سے کم نہ تھیں۔

ایک سلائس کھانے کے بعد اس کا دل بری طرح للچایا اور اس نے دوسرا اسلائس بھی خرید لیا، یہی سوچ کر کہ برطانیہ میں اسے اس قدر لذیذ کیک کہاں ملنے والے تھے۔ ہاں! یہ بات اس کے لیے قدرے افسوس ناک بھی تھی۔

انگیزشِ عدل

اگر وہ لڑکی ذرہ برابر خوش اخلاق ہوتی، تو وہ اس سے ترکیبیں پوچھنے کی ہمت کر ہی لیتا۔ لیکن اتنا ڈر تو اسے ہندوستان کے پہلوانوں سے نہ لگا، جتنا اس بھورے بالوں والی لڑکی سے لگتا تھا۔

وہ کچھ لمحے اپنی زبان پر وہ ذائقہ رقم کیے اخبار پڑھنے لگا۔ وہ اخبار پڑھ تو رہا تھا لیکن اس کے کان آس پاس کے ماحول سے باخبر تھے۔ وہ ایک لکھاری جو ٹھہرا تھا۔ ہر جگہ وہ غیر دانستہ طور پر ہی غور و فکر کرتا تھا۔

اسے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی، اور گھوڑوں کی وہ مخصوص ہنہناہٹ جو بگھی کے رکنے پر پیدا ہوتی ہے۔ یعنی باہر بگھی کھڑی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا، اسے یاسمین عجلت میں بیکری سے باہر جاتی، اور دوبارہ اندر آتی نظر آئی۔ اس کے ماتھے پر مصروفیت کے بل نمودار ہو رہے تھے۔

"گل ناز!" وہ اونچی آواز میں بولی۔

گل ناز نامی ملازمہ بھاگی بھاگی آئی۔

"رشید اب تک نہیں آئے، لیکن بگھی آچکی ہے۔ تم انھیں بلاوہ دے آؤ۔" مصروف سے انداز میں اس نے ہدایت پیش کی۔

گل ناز سر کو خم کے باہر بھاگی۔ وہ وہیں پر کھڑی، گل ناز کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

دفعتاً گل ناز واپس آئی، چمنِ گلاب کی ملکہ نے اسے پر امید نظروں سے دیکھا۔

"یاسمین صاحبہ، کل رات ان کی ٹانگ پر کسی آوارہ کتے نے کاٹا ہے۔ طبیعت ناساز ہے اور اگلے دو سے تین ہفتے تک صحتیابی کی کوئی امید نہیں۔"

خبر سنتے ہی یاسمین کے وجود میں انتشار پھیل گیا۔

"یا اللہ۔" آنکھوں کی پتلیاں پھیلیں۔ وہ ہاتھ آپس میں مسلنے لگی۔ "آج جمعہ ہے۔ ہماری بہنیں ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔" اس کے ماتھے پر مزید سلوٹیں اجاگر ہوئیں۔

البرٹ صورتحال کو بھانپ کر اخبار بند کرتے کھڑا ہوا اور ان دونوں کی جانب بڑھا۔ جہاں گل ناز اپنا چہرہ ڈھانپتے دور جانے لگی، وہاں یاسمین متحمل ہو کر اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

انگیزشِ عدل

”سب خیریت ہے؟ اگر آپ لوگوں کو کسی بھی طرح کی مدد کی ضرورت ہو، تو میں حاضر ہوں۔“

یاسمین نے اس قد آور مرد کو ایک مرتبہ اوپر سے نیچے دیکھا۔ وہ اسے ویسا ہی لگا جیسے تمام برٹش دکھائی دیتے تھے، کم از کم اسے تو سب ایک جیسے لگتے تھے۔ وہی کوٹ پینٹ، سر پر ہیٹ، بھری ہوئی مونچھیں۔ ہاں ایک چیز جو اس میں کچھ مختلف لگی وہ اس کی شہد رنگ آنکھیں تھیں۔ نہیں نہیں، ان آنکھوں کی رنگت مختلف نہ لگی تھی، لیکن اکثر برٹش کے برعکس ان آنکھوں میں دبی دبی تضحیک نہ تھی۔

”نہیں۔ ہم کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ لیں گے۔ ہم گاہکوں سے کام لینے کے عادی نہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔

”آپ اپنی جگہ پر بیٹھ سکتے ہیں۔“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ البرٹ کو سخت گھوری سے نوازا۔

وہ کبھی بھی کسی برٹش سے مدد لینے پر آمادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ کبھی نہیں!

البرٹ بھی کندھوں کو جنبش دیتے، اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”عمارہ، روشی اور گلناز۔ آپ لوگ سامان لے کر آئیں، ہم اکیلے ہی جائیں گے۔“ اس کی بات سن کر تینوں ملازماؤں نے ایک دوسرے کو کوفت کے عالم میں دیکھا۔

”لیکن یاسمین صاحبہ۔“ عمارہ نے بولنے کی ہمت کی۔ راشن کی بوریاں وزنی تھیں، اگر یہ پر مشقت کام اپنے سر لے لیتی، تو کم سے کم ایک آدھ ہڈی تڑوا بیٹھتی اور زیادہ سے زیادہ جاں بحق ہی ہو جاتی!

”آپ بگھی بان سے بھی مدد لے سکتی ہیں۔“ اس نے کہہ کر آنکھیں میچ لیں۔ نہ جانے وہ کس عافت کو دعوت دے چکی تھی؟

یاسمین کی پریشانی میں ڈوبی آنکھوں میں اشتعال کی رمق ابھری۔ باقی ملازماؤں نے دو قدم پیچھے بڑھائے۔

”اگر کام نہیں کرنا تو ہمیں صاف لفظوں میں بتایا جائے۔ آپ سب نے بگھی بان کی عمر دیکھی ہے؟ کیا ہمارے دماغ میں یہ خیال نہیں گزرا؟ آپ ہی بتائیں کیا اس عمر میں بگھی بان یوں بھاری بھرکم بوریاں اٹھاتے اچھے لگیں گے؟“ وہ طیش میں عمارہ کے اوپر برس پڑی۔ پھر ایک نظر باقی دو ملازماؤں پر ڈالی۔

”آپ تینوں ہٹی کٹی ہیں۔ چلیں شروع ہو جائیں۔“

انگیزشِ عدل

ان تینوں کی ہاری ہوئی نظروں کا تبادلہ ہوا۔ وہ باورچی خانے میں برے دل کے ساتھ گئیں۔

البرٹ سب غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کو اندر ہی اندر ہنسی بھی آرہی تھی۔ تو یعنی یاسمین صاحبہ اپنی ضد کے عوض، اپنی بے چاری ملازماؤں پر ظلم ڈھانے والی تھیں۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"ایک کام کریں۔ مجھے اس کام کا معاوضہ دے دیجیے۔ یوں آپ پر بھی یہ بات گراں نہ گزرے گی۔" اس نے مسکرا کر پیش کش کی۔

یاسمین کے ماتھے پر پرسوچ لکیر ابھری۔ وہ اس کی اس بظاہر سی دکھنے والی پر خلوص مسکراہٹ کے فریب میں آنا نہیں چاہتی تھی۔

"ضرورت نہیں۔" صاف انکار کیا تو البرٹ نے بے نیازی سے کندھے اچکا دیے۔

کچھ دیر بعد تینوں لڑکیاں ایک بوری باہر لائیں۔ بوری دروازے تک پہنچی بھی نہ تھی کہ ان کی حالت پتلی ہوگئی اور وہ زمین پر ڈھے کر اونچی اونچی سانسیں لینے لگیں۔ یاسمین کا ضبط بس ٹوٹنے لگا تھا۔

"تم لوگ چھوڑو۔ ہم اکیلے ہی کرلیں گے۔" خفگی سے کہتے وہ بوری اٹھانے لگی۔

بوری واقعتاً بہت بھاری تھا۔ اسے تو حیرت ہونے لگی کہ رشید یہ پر مشقت کام اتنی آسانی سے کیسے کر لیتا تھا۔

وہ ہاری ہوئی سانس خارج کرتے اس بوری کو دیکھنے لگی۔

"ضد چھوڑ دیں لیڈی۔ آپ ہی کی سہولت کے لیے کہہ رہا ہوں۔" وہ پرسکون سے انداز میں اخبار میں نظریں گاڑتے بولا، جیسے یاسمین کے ہاں یا ناں سے اسے خاص فرق نہ پڑنا ہو۔

یاسمین کو وہ آدمی بری طرح کھل رہا تھا۔

"بتائیں۔ ڈال دوں سامان بگھی میں؟" اخبار نیچے کرتے اس نے یاسمین کو دیکھا اور مدہم سا مسکرا دیا۔

یاسمین نے اس پر مشکوک نگاہ ڈالی۔ پھر ایک کوفت آمیز نگاہ اس بوری پر۔ ایک ہاری ہوئی سانس خارج کرتے اس نے البرٹ کو دیکھا جیسے اپنی ہار تسلیم کر چکی ہو۔

چہرے پر ناگواری لیے اس نے گردن ہاں میں ہلا دی۔ البرٹ زیر لب ہنس کر کھڑا ہوا، اور خود کو کام کے لیے

تیار کرنے لگا۔

باورچی خانے میں بیس کے قریب بوریاں تھیں۔ البرٹ ایک ایک بوری کو باہر لے کر جاتا اور بگھی میں منتقل کرتا۔ یوں پینتالیس منٹ کی مشقت کے بعد، سارا سامان بگھی میں منتقل ہو گیا۔

وہ باہر کھڑا ہو کر بگھی کو دیکھ رہا تھا اور یاسمین اس کے پیچھے کھڑی، آنکھوں میں ترحم سا تاثر لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ سانسیں بھی پھول رہی تھیں۔ اس کے باوجود وہ مسکرا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں، یاسمین کو اس مسکراہٹ سے چڑ ہونے لگی تھی۔ شاید اس کے چہرے کا زاویہ ہی کچھ یوں تھا کہ وہ ہمیشہ مسکراتا نظر آتا تھا۔

"اور کچھ۔" وہ ماتھے پر ابھرتا پسینہ ہاتھ کی پشت سے پونچھتے بولا تو یاسمین کی آنکھیں شرمسار ہوئیں۔

"اگر، اگر، اگر۔ آپ کے پاس وقت ہو تو کیا آپ ہمارے ساتھ چل سکتے ہیں۔ ہمیں یہ بوریاں جگہ جگہ اتارنی بھی ہیں۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ دل پر پتھر رکھ کر، اپنی انا کا خون کر کے اس سے درخواست کر رہی تھی۔

مجبوریاں انسان سے سخت ناپسندیدہ کام کروا کر دم لیتی ہے۔

"اگر آپ کی دوسری مصروفیات ہیں تو ہمیں بلا جھجک انکار کر سکتے ہیں۔" وہ اس سے نظریں چرانے لگی۔ ہاتھ آپس میں مسلے۔

البرٹ اس کی بات پر محض مسکرا دیا۔ وہ پورا ہندوستان گھوم چکا تھا۔ یوں اس کی موجودگی میں ہندوستانیوں کا عدمِ تحافظ کا شکار ہونا اس کے لیے عام سی بات تھی۔ اس نے ایک بات اخذ کی تھی کہ ہندوستانی برطانوی شہریوں پر اعتبار کرنے سے کتراتے ہیں۔

"کیوں نہیں۔ میں تو ویسے بھی ایک لکھاری ہوں، محترمہ۔ دن بھر کے تجربات رات کو اپنے قلم کے ذریعے کاغذ کے سپرد کر دیتا ہوں۔" وہ جتنی بد اخلاق اور روکھی تھی وہ اتنا ہی گرمجوش اور خوش اخلاق واقع ہوا تھا۔

یاسمین پھیکا سا مسکرائی اور دوسری بگھی میں چڑھ گئی۔ البرٹ بھی اس کے ہمراہ بگھی میں سوار ہو گیا۔ دونوں کے درمیان مختصر سا فاصلہ حائل تھا۔

وہ بگھی کے کناروں سے چپک کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے پرس کو سختی سے گود میں جکڑا ہوا تھا۔ حواس

چوکنّا تھے اور آنکھیں محتاط۔

گھوڑے ہنہنائے۔ بگھی امرتسر کی تنگ گلیوں میں دوڑتے، ایک گلی سے دوسری گلی کی سیر کرتی۔ اور یوں وہ ایک کالونی سے دوسری کالونی جاتے اور گھر گھر رکتے۔

پہلے یاسمین اتر کر دروازے پر دستک دیتی۔ اس کا استقبال کرنے، ہمیشہ کوئی نہ کوئی عورت رونما ہوتی تھی۔ یاسمین کو دیکھتے ہی ان کے چہروں پر تشکر آمیز تاثر ابھرتا۔

البرٹ سب کچھ غور سے دیکھ رہا تھا اور ایک بات جو اس کے دماغ میں ٹھاکر کے لگی تھی، وہ یہ کہ یاسمین کا چہرہ ہمیشہ پتھریلا ہی رہتا۔ سامنے والا چاہے خوشی سے اچھل کود شروع کر دے لیکن وہ ساکت رہتی۔

ہر گھر کے دروازے پر راشن کی بوریاں رکھنے کا کام البرٹ کا تھا۔ اس نے ایک چیز پر مزید غور کیا تھا کہ ہر کوئی اسے گھور گھور کر کچھ اس طرح دیکھتا جیسے وہ کوئی ہوائی مخلوق ہو۔ اس عمل سے اسے کوفت محسوس ہونے لگی تھی۔

یہ تب کی بات ہے جب دوپہر ڈھلنے کو تھی اور آدھے سے زیادہ بوریاں گھروں میں پہنچا دی گئی تھیں۔

البرٹ بگھی سے بوری گھسیٹ ہی رہا تھا جب اسے یاسمین اور ایک عورت کی گفتگو سنائی دی۔

”یاسمین۔ یہ تمھارے ساتھ انگریز کیا کر رہا ہے؟“ وہ سرگوشی کر رہی تھی لیکن البرٹ کے کان ضرورت سے زیادہ تیز تھے۔

”رشید کی طبیعت ناساز ہے، ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ جلدی جلدی میں انھی کی مدد لینی پڑی۔“ یاسمین کی آواز بلاتاثر تھی۔

”پھر بھی احتیاط کیا کرو۔“

البرٹ نے بے دلی سے بوری کندھے پر لاد دی۔ ہندوستانی خواہ ہی باتیں گڑھتے تھے کہ برٹش مغرور ہوتے ہیں، یہاں تو ہر ایک شخص اسے تحقیر سے دیکھتا تھا، نفرت سے دیکھتا تھا۔ پھر مغرور کون ہوا؟

”خیر۔ جنت، آپ یہ رکھیں۔“ یاسمین نے اپنے پرس سے چند سکے اور نوٹ نکالے اور جنت کے ہاتھ میں تھما دیے۔ جنت نے انھیں تھام کر، گردن نفی میں ہلائی۔ آنکھوں میں نمی اتری۔ وہ بے ساختہ ہو گئی تھیں۔

”نہیں یاسمین۔ تم جو ہم بیواؤں اور لاچار عورتوں کے لیے کر رہی ہو، یہی کافی ہے۔ اس سے زیادہ میں ایک کوڑی نہیں لوں گی۔ میرا ضمیر مجھے اس بات کی اجازت نہیں دے گا۔“ جنت کی آواز اب کہ نم تھی۔

البرٹ اس سب میں بس یاسمین کے چہرے کو تک رہا تھا جو کہ ہمیشہ کی طرح بلا تاثر رہا۔ اس کو تعجب ہوا کہ وہ ہمیشہ سے ہی ایسی تھی یا حالات نے اسے ایسا بنا دیا تھا؟

”اس میں ایسا کیا ہے جو آپ کا ضمیر اجازت نہیں دے رہا؟ یہ تو احمد اور حماد کے لیے ہے۔ ان کی سالگرہ ہے نا اس ہفتے۔ اب وہ ہمارے بھانجے ہوئے تو اتنا تو ہم کر سکتے۔“ اس نے نرمی سے ہاتھ جنت کے تر گال پر رکھا جیسے انھیں منا رہی ہو۔ آنکھیں اب بھی سرد تھیں۔

”مجھے ڈر لگتا ہے یاسمین۔۔۔“ وہ بولتے بولتے رک گئیں۔ جیسے وہ جانتی ہوں، کہ جو وہ بولنے والی تھیں، اس سے اس بھورے بالوں والی لڑکی کا دل بری طرح سے ٹوٹ جائے گا۔

یاسمین نے مایوس کن سانس خارج کی جیسے ان کا جملہ وہ بوجھ چکی ہو۔ اس نے جنت کو کندھوں سے جکڑا۔ آنکھوں میں پل بھر کو نرمی سی اتری۔

”اگر آپ کو یہ اندیشہ ہے کہ سیدہ یاسمین مجاہد اپنی بہنوں کو بے سہارا چھوڑ دے گی، تو آپ سراسر غلط ہیں۔ ہاں، ہماری آپ سب سے خونی وابستگی نہیں۔ لیکن، جانتی ہیں ہمیں کون سی شے اٹوٹ بندھن میں باندھتی ہے؟ ہمارا دکھ درد سانجھا ہے!

اور جب تک ہمارے جسم میں سانسوں کی روانی ہے، ہم اس بندھن کو نبھانے کے قائل ہیں۔ آئندہ کبھی بھی یہ خیال آپ کے ذہن کے در کھٹکھٹائے تو اسے جھڑک دیجیے گا۔“ اور جتنی تیزی سے اس کی آنکھوں میں نرمی اجاگر ہوئی تھی اتنی ہی تیزی سے فنا بھی ہو گئی۔

البرٹ کندھے پر بوری لاد کر، بس اسے دیکھتا گیا۔ اب کہ وہ لڑکی اسے پہلے سے بھی زیادہ دلچسپ لگی۔

کون سے غم ہوں گے، جو انھیں ایک کرتے ہوں گے؟ نہ جانے یہ ہندوستانی اس قدر خود ترسی کا شکار کیوں تھے؟ اس نے دل ہی دل میں سوچ کر سر جھٹکا اور لاپرواہی سے بوری دروازے پر رکھ دی۔

انگیزشِ عدل

جیسے تیسے یہ دن بھی گزر گیا۔ کام ختم کرتے، رات بیت گئی تھی۔ وہ دونوں بگھی میں سوار تھے اور واپسی کے راستے پر گامزن تھے۔

”ایک سوال پوچھنے کی اجازت مل سکتی ہے؟“ ادب سے کہتے اس نے خاموشی کو توڑا۔

صبح کے برعکس یاسمین پرسکون اور پراطمینان تھی۔ وہ حواس چوکنّا نہ کیے ہوئے تھی، نہ ہی آنکھوں میں ساختگی تھی۔

”جی۔“ اس نے گہری سانس خارج کرتے جواب دیا۔

”یہ سب کس تکلیف کی بات کر رہے تھے؟ کیا میں جان سکتا ہوں۔“

یاسمین نے سست روی سے گردن گھمائی اور البرٹ کی متجسس آنکھوں میں اپنی پتھریلی نگاہ گاڑی۔

”ہم سب کے گھروں میں والی وارث نہیں۔ کچھ نے اپنے باپ، بیٹوں اور شوہروں کو عظیم جنگ میں گنوادیا ہے تو کچھ نے۔۔۔“ کہتے کہتے اس کی آواز اٹکی۔

البرٹ کو پہلی مرتبہ اس کی آواز کی گہرائیوں میں کرب سنائی دیا۔

نہیں، البرٹ نے سوچ کر جھٹکا، یہ پہلی مرتبہ نہیں تھا۔ اس کی آواز میں ہمیشہ سے کرب جھلکتا تھا۔ جسے وہ مہارت کے ساتھ سرد مہری کے ذریعے ڈھانپنے کی کوشش کرتی تھی۔

یہ انسان بھی کیا چیز ہے۔ اپنے غموں کو ڈھانپنے کے لیے کیسی کیسی تدبیریں لڑاتا ہے۔ مگر غم کے طوفانوں کو دبا کر اس اذیت کو جھیلنے سے نہ جانے حاصل کیا ہی ہو جاتا ہے؟

”اور کچھ نے انھیں جلیاں والا باغ کے سانحے میں گنوادیا۔“ اس کی آواز بھلے نم تھی لیکن آنکھیں سوکھی، ویران اور خالی تھیں۔ وہ جیسے خود سے جنگ لڑ کر اپنے آنسوؤں کو آنکھوں میں منڈلانے سے روک رہی تھی۔

البرٹ اسے شاک کے عالم میں دیکھتا گیا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ آخر کیا ہوگی یاسمین کی کہانی؟ یہ سوال اسے ذہنی خلفشار میں مبتلا کر گیا۔

”سن کر افسوس ہوا۔“ گردن موڑ کر، مغموم آنکھیں جھکائیں۔

اس بات پر یاسمین طنزیہ سا مسکرا دی۔

"جان کر اچھا لگا۔"

اس کا انداز البرٹ کو بہت برا لگا۔ اس کا دل دکھی ہو گیا تھا۔ وہ ایسے طنز کیوں کر رہی تھی جیسے جتانا چاہ رہی ہو کہ، اسے البرٹ کے افسوس پر یقین نہیں؟ البرٹ نے باقی کا سفر خاموشی سے کاٹا۔

بگھی اس گلی کے پاس ٹھہری جہاں یاسمین کا گھر واقع تھا۔

"کل صبح آ کر معاوضہ لے جایئے گا، مسٹر۔۔۔"

"البرٹ۔" گزشتہ تلخ کلامی کو نظر انداز کرتے، اس نے مسکرا کر اپنا نام بتایا۔

"اور آپ کا نام؟" وہ نام سن چکا تھا لیکن اب خود اس کے لبوں سے سننا چاہتا تھا۔

"یاسمین مجاہد۔ سیدہ یاسمین مجاہد!" گردن اکڑا کر وہ ایک شان سے بولتے، بگھی سے اتری اور گلی میں کہیں گم ہو گئی۔

بگھی چل پڑی اور وہ ایک بار پھر سے سوچوں میں غرق ہو گیا۔

اس لڑکی کے تعصب آمیز نظریات سے اسے بھلے سے شدید اختلاف تھا، لیکن ایک بات کا تابع وہ ہو چکا تھا کہ وہ لڑکی بالکل ویسی نہ تھی جیسا خود کو ظاہر کرتی تھی۔

......☆☆☆......

بگھی سرائے کے باہر رکی تو اس نے اپنا بوجھل اور تھکان زدہ جسم باہر نکالا۔ آنکھیں بمشکل کھول کر وہ سرائے میں داخل ہوا اور چائے خانے کی خالی میز کے گرد بیٹھ گیا۔ کچھ دیر گردن ڈھیلی چھوڑ کر اپنے کندھے کے پٹھوں کو کھینچنے لگا۔ تکان میں تخفیف آئی تھی۔

دفعتاً سرائے کے عملے کا عبد المجید اس کے پاس سے گزرا۔ البرٹ کو دیکھتے ہی، وہ رک گیا۔

"کیسے ہو البرٹ؟" وہ اسے دیکھ کر چہکا۔

البرٹ نے آنکھیں کھول کر گردن اٹھائی۔

”کچھ تھکے تھکے لگ رہے ہو۔“

”ہاں۔کام کے چکر میں پورا امرتسر گھوم لیا۔“

یکدم اسے یاسمین کا کرخت چہرا یاد آیا، یاسمین کی وہ آواز یاد آئی جس میں کچھ دیر قبل اس نے کرب بھانپا تھا۔ اس کے لبوں سے ادا ہوا، ایک ایک لفظ اس کے ذہن کے خانوں میں بازگشت کر رہا تھا۔

”خیر، کچھ کھانے کو لاؤں؟“عبدالمجید نے خوش دلی سے پیش کش کی۔

”جی۔اور اپنے لیے بھی لے آؤ۔کچھ باتیں کرنی ہیں۔“اس کی آواز کچھ کمزور لگ رہی تھی۔

بلا تاخیر، عبدالمجید پکوان سے سجی ہوئی تھال اٹھالایا۔

”تمھاری کتاب کہاں تک پہنچی۔“اس نے البرٹ کے مقابل، کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے پوچھا۔

البرٹ گلاس سے ڈھیر سارا پانی نگلنے لگا۔اور بس ایک ہی گلاس نے دن بھی کی پیاس بجھادی۔

”بس امرتسر میں اپنے تجربات بیان کر کے اس کتاب کو ایک خوبصورت اور پر اثر اختتام دینا ہے۔“وہ کچھ سوچ کر بولا۔

عبدالمجید روٹی سے قیمہ لگا لگا کر کھانے میں مگن تھا۔

”ایک بات پر غور کیا۔یہاں باقی انگریز افسر وغیرہ پینے پلانے کے عادی ہیں۔مگر تمھیں آج تک پیتے نہیں دیکھا۔“اس نے نوالہ حلق میں اتارا۔

البرٹ زیرِلب ہنس کر زخمی سا مسکرایا۔

”ہمارا ماضی حال کی عادتوں کو تشکیل دیتا ہے۔“اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔”اور حال کی عادتیں مثبت ہوں تو مستقبل کا خوشگوار ہونا بہت حد تک یقینی بن جاتا ہے۔“

عبدالمجید کچھ لاجواب ہوا۔

”میں نے اپنے گرینڈ پا کو شراب نوشی کی وجہ سے بڑی دردناک موت مرتے دیکھا ہے۔شراب نوشی، لونڈے بازیاں اگر عیش و آرام ہے، تو مجھے عیش کرنا ہے نہ آرام۔“اب کہ نگاہوں میں ذرا سی تلخی ابھری۔

انگیزشِ عدل

”واہ البرٹ میاں۔ واہ۔ دل جیت لیا تم نے تو۔“ عبد المجید اپنی پلیٹ پر جھک کر بولا۔ نان سے قیمہ لگائے نوالہ بنا کر حلق میں اتارا۔

البرٹ نے بس سر جھٹک دیا۔ شہد رنگ آنکھیں بند کیں۔ وہی گندمی چہرا ذہن میں ابھرا تھا۔ کان میں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی، دن بھر کے تجربات پل بھر میں ان آنکھوں کے پیچھے رواں ہوئے۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ بے قرار تھیں، یوں جیسے کچھ کھوج رہی ہوں۔

”مجید۔ تم سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟“ البرٹ نے اسے بغور دیکھا۔

”ایک کیا۔ دس پوچھو۔“ وہ نوالہ حلق میں اتارتے، خوش اسلوبی سے بولا۔

بات شروع کرنے سے قبل البرٹ نے گہری سانس اندر کھینچی۔ اسے اپنا آپ کسی ظالم سا محسوس ہو رہا تھا، مگر وہ اپنے تجسس کو ہاتھوں مجبور ٹھہرا تھا۔

”کیا تم مجھے جلیاں والا باغ سانحے کے متعلق کچھ بتا سکتے ہو؟ میں نے اس کے بار میں اخبارات میں پڑھا تو تھا، لیکن ایک دفعہ سب تمھاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“

یکبارگی عبد المجید کی مسکراہٹ فنا ہوئی۔ آنکھوں میں جو چمک تھی اس کا دم گھٹ گیا۔ البرٹ تاسف سے اسے دیکھتا گیا۔ البرٹ کو یاد آیا تھا کہ رنج والم کی یہی کیفیت یاسمین پر بھی طاری ہوئی تھی۔

”کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم نے کیا پڑھا تھا؟“ وہ البرٹ سے نظریں ملائے بغیر بولا۔ نوالے توڑتا ہاتھ تھم گیا تھا۔

البرٹ نے اس کے انداز میں گھلتے کھچاؤ کو بخوبی بھانپ لیا تھا۔

”یہ کہ احتجاجیوں کے پاس اسلحہ تھا۔ اور ان میں سے کچھ ہی مارے گئے تھے، وہ بھی ضرورت کے تحت۔“ البرٹ کو جو معلوم تھا، اس نے اگل دیا۔

عبد المجید استہزاء سے مسکرایا۔ اب کہ اس نے گردن اٹھائی تو اس کی آنکھیں کرچیوں کی مانند بکھری ہوئی تھیں۔ ایسے جیسے اس کے اندر کوئی توڑ پوڑ برپا ہو گئی ہو۔ کوئی بھونچال آ گیا ہو۔

انگیزشِ عدل

"کیا واقعی تم سچ سننے کی سکت رکھتے ہو؟" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

البرٹ اس کی آنکھوں میں دیکھتے کچھ سوچتا رہ گیا۔ یہ کیسے زخم تھے جو اس قدر اذیت دے رہے تھے؟ جنھوں نے بس ایک پل، صرف ایک پل میں عبد المجید کے چہرے کی رونق چھین لی تھی؟

"میں سچ سننا چاہوں گا۔" آواز خلاء سے نکلی۔

عبد المجید نے گہری سانس خارج کی۔ بعض دفعہ سچ کو دہرانا کانٹے دار فرش پر لوٹ جانے جیسا معلوم ہوتا ہے۔

"اسی واقعے میں میں نے اپنے والد صاحب کو کھویا تھا۔" وہ یوں بولا جیسے اس کے سامنے کوئی دردناک فلم چل پڑی ہو۔ اور وہ جیسے جیسے فلم کے منظر دیکھ رہا ہو، ویسے ویسے بیان کرتا جا رہا ہو۔ ان بدلتے منظروں کے ساتھ آنکھوں کے رنگ بھی تبدیل ہو رہے تھے۔

البرٹ پورے وثوق سے اسے سن رہا تھا۔

"وہ دن مجھے آج بھی ہو بہو یاد ہے، البرٹ۔" اس کی آنکھیں پھیلیں۔ ان میں نفرت ابھری۔ نفرت کے سائے میں دبی دبی تکلیف تھی اور بے بسی بھی۔

"ہم سب پر امن احتجاج کر رہے تھے۔ نہ ہمارے پاس کوئی بندوق تھی نہ تلوار۔ صرف ہاتھوں میں بینرز تھے اور ہم، ہم آواز ہو کر احتجاج کر رہے تھے۔ راؤلیٹ ایکٹ کے خلاف، اپنے لیڈرز کے لیے جن کو زندانوں میں پھینکا ہوا ہے۔ ہم اپنے لیے احتجاج کر رہے تھے، اپنے ہندوستانی بہن بھائیوں کے لیے احتجاج کر رہے تھے، اپنے خلیفہ کے لیے احتجاج کر رہے تھے۔ کیونکہ احتجاج ہمارا بنیادی حق ہے۔ ہمارے نظام کو سنبھالنے والے، ہماری آوازوں کو دبانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟" اس نے ایک وقفہ لیا۔ دل میں دفن جذبات ابل پڑے۔ آنکھیں اشک برسانے لگیں۔ چہرہ سُرخی مائل اور دھواں دھواں ہونے لگا۔

البرٹ کی شہد رنگ آنکھیں مرجھائیں۔ سینے میں تناؤ بڑھنے لگا۔ چائے کھانے کی فضا، جہاں ہمیشہ اسے خوشیاں کا گمان ہوتا تھا، آج وہاں پہلی مرتبہ اس نے سوگوار یت محسوس کی تھی۔

"پھر جلیاں والا باغ میں موت کا سماں چھا گیا، البرٹ۔ یکدم بھگ دڑ مچ گئی۔ تکلیف دہ چیخیں، آہیں گونج

اٹھیں۔ وہ لوگ ہمیں گولیوں سے بھون رہے تھے۔ زیادہ تر کو انھوں نے مار دیا اور کچھ اس بھاگ دوڑ میں کچل دیے گئے۔ اس دن جلیاں والا باغ میں خون کی ہولی کھیلی گئی تھی۔ ہمارے ہی خون کی، سُرخ ہولی۔" بات کو اختتام کرتے، اس نے گیلی سانس اندر کھینچی، آنسو صاف کیے، اور نظریں پھر سے جھکا لیں۔

البرٹ کے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ اس کی شہد رنگ آنکھیں رنج میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ سچ واقعتاً المناک تھا۔ اس نے خود سے تسلیم کیا۔

"کتنے لوگ جاں بحق ہوئے؟" اس کی آواز شدتِ تکلیف کے باعث لرکھڑائی۔

"درست تعداد تو آج تک معلوم نہ کی جا سکی، مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ہزاروں مارے گئے۔ ہزاروں آج تک معذور ہیں۔ ہمارا شہر، امرتسر بھی زخمی ہے۔ اگر شہروں کی زبان ہوتی تو امرتسر کی سسکیاں صدیوں تک دنیا میں گونجتیں۔" اس نے مایوس کن سانس خارج کی، مگر گردن نہ اٹھائی۔

"مگر ہم تو اس شہر میں پلے بڑے ہیں۔ اس مٹی سے گہری آشنائی ہے ہماری، البرٹ۔" گردن اٹھی۔ چہرا آبدیدہ تھا۔

"اس مٹی کو ہم سے کلام ہونے کے لیے کسی زبان کی ضرورت نہیں۔ ہم اس کی دھاڑیں سن سکتے ہیں۔" آخر میں گھائل مسکراہٹ لبوں پر رقص کر گئی۔

البرٹ کا دل کسی باریک پتے کی مانند پھڑ پھڑانے لگا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ یاسمین کسی تعصب کا شکار نہیں تھی۔ نہ ہی وہ لوگ جو اسے اجنبیت اور بے اعتمادی سے دیکھ رہے تھے، وہ کچھ غلط کر رہے تھے۔

جب ان کو حکومت نے، اس کے اپنے لوگوں نے گھاؤ اتنے گہرے دیے تھے تو وہ کیسے کسی پر بھروسہ کرتے؟ اسے ان تحقیر آمیز نگاہوں، اس عدم تحفظ کی کڑی وضاحت مل گئی تھی۔

دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ ایک رنج کے عالم میں نہ بولا اور دوسرے کو احساسِ جرم نے کچھ کہنے نہ دیا۔ حکمران ظلم ڈھا تو دیتے ہیں، گناہ کر تو لیتے ہیں، بڑے سے بڑا جرم کر تو لیتے ہیں۔ مگر یہ کیونکر بھول جاتے ہیں کہ ان کے کیے کا بوجھ ان کی قوم کو اٹھانا پڑتا ہے۔ معصوموں کو بھری محفلوں میں رسوائی اور ذلت اٹھانی پڑتی ہے۔

انگیزشِ عدل

......☆☆☆......

کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں لوٹ آیا تھا۔ دن بھر جسم پر لگنے والی گرد و غبار کافی تھی جو اب روح پر بھی گرد کو تہہ آن چمٹی تھی؟

اس نے غسل خانے کا رخ کیا۔ نہا دھو کر، لباس تبدیل کر کے وہ اپنی میز پر بیٹھا۔ جسم صاف ہو چکا تھا، مگر باطن کا کیا کرے؟ جو مچل رہا تھا؟ روح کے اس ہیجان کا کیا کرے جو اس بے چین کیے ہوئے ہوئے تھا؟

ہمیشہ کی طرح اس نے اپنے قلم اور کاغذ کے ذریعے فرار تلاش کرنے کی ٹھانی۔ وہ الفاظ میں سکون تلاش کرنے والوں میں سے تھا۔ بے چین سے بے چین راتیں کاٹنا بھی، آسان بنانے کی طاقت رکھتے تھے یہ الفاظ۔

کاغذ کے صفحات تیار تھے اور قلم بھی وہیں موجود تھا۔ خالی کاغذ اسے لکھنے کی دعوت دے رہا تھا۔ اور آج وہ لکھنے کے لیے کچھ زیادہ ہی پر جوش تھا۔ آج اس کے دل و دماغ میں الفاظ کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ وہ بھی ان میں کسی نازک تنکے کی طرح بہہ جانا جاتا تھا۔

قلم اٹھاتے اس نے لکھنا شروع کیا۔ دنیا سے ایک بار پھر منقطع ہو کر وہ لفظوں میں غرق ہو گیا۔ بس پورے جہاں میں وہ تھا، اور اس کے الفاظ۔

"آج جو میری کیفیت ہے وہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر پا رہا۔ ایسا نہیں ہے کہ میرے پاس الفاظ نہیں، بلکہ آج الفاظ کی کثرت کچھ یوں ہے کہ میرا قلم الجھن کا شکار ہو گیا ہے۔ بس یوں سمجھ لیا جائے کہ البرٹ ونسٹن آج صحیح معنوں میں دنگ رہ گیا ہے۔ بلکہ نہیں، البرٹ نے جانا ہے کہ صحیح معنوں میں دنگ اور گنگ ہونا کیسا ہوتا ہے!

مجھے گمان تھا کہ، کلکتے کا سفر میرے لیے سب سے یادگار ہے۔ لیکن امرتسر نے مجھے غلط ثابت کیا۔ جو میں اس سفر میں سیکھ رہا ہوں، جان رہا ہوں، وہ میرے اندر کچھ تبدیل کر رہا ہے، میرے نظریات بدل رہا ہے۔ میری آنکھوں پر سے جھوٹ اور فریب کے پردے ہٹا کر، مجھ پر سچ عیاں کر رہا ہے۔

پہلی چیز جو میں اس سفر میں سیکھی وہ یہ کہ، ہر چیز جیسی دکھائی دے، حقیقت میں ویسی نہیں ہوتی۔ ہاں، یہ فقرہ کافی مرتبہ سن چکا ہوں لیکن اس فقرے کو عملی جامہ پہنتے آج دیکھا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ انسان کے معیوب رویوں

کے پیچھے خاص وجوہات ہوتی ہیں، ایک کہانی چھپی ہوتی ہے۔ اگر آپ کبھی دیکھیں کہ کوئی انسان آپ سے مختلف رویہ برتتا ہے تو اس کے پیچھے چھپی کہانی دریافت کریں، کیونکہ آگہی دلوں کو بوجھ سے آزاد کر دیتی ہے۔

تیسری بات، جو سچ آپ کو بتایا جاتا ہے، ضروری نہیں وہ سچ کی حیثیت رکھتا ہو۔ کبھی کبھی سچ کو بھی ناپ تول کر کے، اس میں ملاوٹ کر کے، اس میں جھوٹ کا چھڑکاؤ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ چوتھی بات، جو پہلی سے کافی مشابہت رکھتی ہے وہ یہ کہ، ہر پتھریلا اور سفاک چہرا پتھریلے دل کا مالک نہیں ہوتا، بعض دفعہ یہی دل تو دنیا کے خالص ترین دلوں میں سے ہوتے ہیں۔ جن میں محبت کا مادہ سب سے بڑھ کر ہوتا تھا۔

جس لڑکی کو میں کل تک ایک جنگ جو، نکچڑی اور خواہ مخواہ کی غصیلی تصور کر رہا تھا، اس نے مجھے غلط ثابت کیا۔ ہاں میں چمنِ گلاب کی مالکن کی بات کر رہا ہوں۔ کچھ حد تک اس کا کھڑوس بد اخلاق رویہ میری سمجھ میں آنے لگا ہے۔

مشہور ہے کہ ہم لکھاری اور شاعر ہر جگہ عورتوں کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ سیاہی سے صفحے پر صفحہ بھرتا جاتا ہے، مگر ان کی باتیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ مگر میں کیا کروں؟ خاتون ہیں ہی ایسی۔ اپنی باتوں سے، اپنی چال سے، اپنے رہن سہن سے ایسا اثر چھوڑ گئی ہیں، کہ میرا دماغ ان کے سوا کچھ بھی سوچنے سے قاصر ہے۔

وہ ایک راز کی مانند ہیں۔ گہرا راز، بہت گہرا، کسی کھائی کی طرح جس کی سطح پر کانٹے ہی کانٹے ہوں۔ لیکن ان کانٹوں کے باجود میں اس کھائی میں اترنا چاہتا ہوں، جانتا ہوں کہ تکلیف سے لہولہان ہو جاؤں گا، لیکن شاید وہ راز اس قابل ہیں کہ ان کے لیے لہولہان ہوا جائے۔

اب سوال آتا ہے کہ یوں میرے نظریات کیسے بدل گئے۔ تو ہوا یہ کہ۔۔۔"

رات گہری ہوتی گئی۔ لکھتے وقت موہوم مسکراہٹ اس کے لبوں سے جدا نہ ہوئی۔ آج جو بھی اس نے لکھا، دل سے لکھا۔

اور جب لکھاری الفاظ دل سے لکھتا ہے، تو وہ صرف الفاظ نہیں رہتے وہ کسی مصور کا شاہکار بن جاتے ہیں۔

......☆☆☆......

زمین نے اپنا چکر چار بار مکمل کیا۔ سورج نے اس دوران امرتسر کے آسمان پر چار مرتبہ حاضری دی۔ رات کو

انگیزشِ عدل

آسمان پر اپنی موجودگی سے شرف قمر نے بخشا تھا۔ اس دوران آسمان کی تاریکی میں سینکڑوں ستارے آکر گزرے۔

گزشتہ چار روز میں ہندوستان بھر لاتعداد احتجاج ہوئے۔ ہندوستانی مسلمان خلافت کے بچاؤ کے لیے سڑکوں پر نکلے ہوئے تھے۔ اور ایسے ہی قوی احتجاج امرتسر میں بھی ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں بینرز لیے، مسلمان سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ اور اونچی اونچی آواز میں نعرے لگاتے تھے۔ جیسے کہ: "خلافت زندہ باد"، "انقلاب زندہ باد"، "سلطنتِ عثمانیہ کی جے!"، "برٹش راج مردہ باد"، "سرحد پار مسلمان کی شان!"۔

ملک کے حالات دن بہ دن بگڑتے جا رہے تھے۔ چونکہ برطانوی حکومت عظیم جنگ کے بعد دیگر ملکی، سیاسی معاملات میں مصروف تھی، اس لیے ان احتجاجوں کو روکنے کے لیے، جبر کا استعمال کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہ کرتی تھی۔ برٹش پولیس کئی مرتبہ احتجاجیوں پر لاٹھی چارج کر دیتی اور ان کے لیڈرز، بشمولیت احتجاجیوں کو بڑی تعداد میں گرفتار کیا جا رہا تھا۔ روزمرہ کی بنیاد پر باغیوں کو سولی چڑھایا جا رہا تھا۔ اس سب کے بعد بھی کیا مہم خلافت کے زور میں کمی آ رہی تھی؟

ہرگز نہیں۔ مسلمانوں کے احتجاج میں دن بہ دن قوت بڑھتی جا رہی تھی۔

تو یہ تھا ہندوستان کا پسِ منظر۔

چمنِ گلاب آنا تو البرٹ ونسٹن کا معمول بن چکا تھا۔ وہ ہر روز کوئی نئی شے آزماتا، اسے کھانے کے بعد برٹش اخبار پڑھتا (اس وقت برٹش حکومت نے ہندوستانی اخبار پر بین لگایا ہوا تھا کیونکہ اکثر اخبار برٹش راج کے خلاف بات کرتے تھے۔) اور جب دن کا اجالا ڈھل جاتا، وہ اپنی آرام گاہ کی خاموشی میں، اپنے تجربات قلم بند کر لیتا۔

یاسمین کو اب البرٹ کی عادت ہونے لگی تھی۔ وہ اسے اپنے آپ میں مگن ایک انسان لگتا تھا۔ اس پورے دورانیے اس نے کچھ بھی قابلِ اعتراض نہیں کیا تھا۔

اس نے مسکرا کر چمنِ گلاب کے سامنے اپنی سائیکل پارک کی۔ ایک نظر اس تختی کو دیکھا۔ آج اس نے یہاں کی چکن بریڈ آزمانی تھی، اس لیے کافی پرجوش تھا۔ دفعتاً اس کی نظروں کا مرکز پولیس کی وہ دو بائیکس بنیں۔ بھنویں سکیڑتے اور چہرے پر تشویش لیے وہ اندر داخل ہوا تو وہ منظر اس کے سامنے عیاں ہوا۔

انگیزشِ عدل

چمنِ گلاب کے بیچ و بیچ دو برٹش پولیس اہلکار کھڑے تھے۔ دونوں خاکی یونی فارم میں ملبوس تھے۔ ان کی آنکھوں میں دبادبا سا رعب تھا۔ ایک پولیس اہلکار یاسمین کی کلائیوں پر ہتھکڑیاں لگا رہا تھا۔ اس کی چھاتی پر تختی لگی تھی جس پر اس کا نام درج تھا۔ وہ ولیم تھا۔ اور دوسرا کھڑے ہو کر آس پاس کا جائزہ لے رہا تھا، وہ جیمس تھا۔

یاسمین جب کہ گردن اکڑ کے کھڑی تھی، چہرے پر شانِ استغنا تھی۔ اسے جیسے ولیم کے ہتھکڑی لگانے سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

البرٹ کی آنکھیں چھوٹی ہوئیں۔ وہ سست روی سے پولیس کی جانب بڑھا۔ جیمس نے اسے دیکھتے ہی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا کیونکہ وہ بھی ایک برٹش ہی تو تھا۔ البرٹ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرایا۔

"کیا میں ان کی گرفتاری کی وجہ جان سکتا ہوں؟" وہ ادب سے بولا تو جیمس نے سر اوپر نیچے ہلایا۔ اپنی جیب سے ایک تہہ شدہ پامفلیٹ نکالا۔

البرٹ نے اسے تھام کر پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے وہ پڑھتا، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتیں۔ اس نے ایک نظر یاسمین کو دیکھا جو کہ بالکل لاتعلق سی کھڑی نہ جانے کس کو دیکھ رہی تھی۔ اس پورے عمل سے جیسے اسے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔

اس پامفلیٹ میں برٹش راج کے خلاف بہت سی باتیں درج تھیں۔ خلافت کے حق میں کیا کچھ نہیں لکھا تھا۔

البرٹ نے سب پڑھ کر، ایک پر سوچ سانس خارج کی اور جیمس کو دیکھا۔ آنکھیں جیسے مزید وضاحت کی طلبگار تھیں۔

جیمس نے اس کی شہد رنگ آنکھوں میں وضاحت سننے کی چاہ دیکھی۔

"مجھے شک ہے کہ ان پامفلیٹ کی اس بیکری سے، خاص کر اس کی مالکن سے وابستگی ہے۔ مجھے یہ باہر ہی ملا تھا۔" جیمس اپنی بڑھی ہوئی شیو کھجاتے بولا۔

البرٹ کاغذ نیچے کر کے، کچھ سوچنے لگا۔ شاید وہ اپنے ذہن میں الفاظ ترتیب دے رہا تھا۔

"میں چمنِ گلاب روز آتا ہوں۔ تاہم مجھے لگتا ہے کہ یہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ پامفلیٹ یقیناً کسی گاہک کا ہو گا۔" اس بات پر جہاں ولیم کے کان کھڑے ہوئے، وہاں جیمس نے ٹھوڑی پر ہاتھ رکھا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

"کیا تمھیں یقین ہیں؟"

"ہاں۔ میں البرٹ ونسٹن ہوں۔ نزدیک ایک سرائے ہے، جس میں قیام پذیر ہوں اور آج تک مجھے اس بیکری میں کوئی بھی قابلِ اعتراض شے نہ ملی، نہ دکھی۔"

البرٹ نے بات مکمل کی۔ جیمس بری طرح چونک گیا۔ اس کی آنکھیں پھیلیں اور لب خوش گوار حیرت کے باعث جدا ہوئے۔

"البرٹ ونسٹن!" وہ دبے دبے جوش سے بولا اور دوبارہ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھانے لگا۔

اس پرجوش طرزِ عمل پر البرٹ بوکھلاہٹ کے عالم میں مبتلا ہوا۔ جیمس نے کلام جوڑتے، بات جاری رکھی۔

"میں آپ کے کام کا مداح ہوں۔ آپ کی ڈیٹیکٹو سیریز کی ساتوں کتابیں پڑھ چکا ہوں۔ آٹھویں کا بے صبری سے انتظار ہے۔" وہ بھلا بیٹھا کہ وہ ایک پولیس افسر ہے، اور یہاں کام کے سلسلے میں آیا ہے۔ اندر بسے قاری نے جوش جو مار لیا تھا۔

البرٹ کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ بکھری اور رُخسار سُرخ ہوئے۔

"یہاں اپنی سرزمین سے دور میرے پاس فرار کا صرف ایک ہی راستہ ہوتا ہے۔ کتابیں۔ بالخصوص آپ کی کتابیں!"

البرٹ نے سر کو ادب سے خم دیا۔ اپنے قارئین سے یوں ملنے کا تجربہ، بلاشبہ نایاب ہوتا تھا۔

"آپ آٹھویں کیوں نہیں پڑھ رہے؟ ایسا کریں سرائے آجائیں، میں آپ کو فراہم کر دوں گا۔ ڈیٹیکٹو کا کردار آپ کو دنگ چھوڑ دینے والا ہے۔" البرٹ کو تو ویسے بھی اپنے کام کے بارے میں باتیں کرنے کا بہت شوق تھا، اس لیے پورے جوش و خروش کے ساتھ بولا۔

پیچھے سے ولیم نے گلہ کنکھارا۔ جیمس کو یاد آیا کہ وہ ایک پولیس افسر ہے۔ اس نے اپنے اندر بسے اس جوشیلے قاری کو قابو کیا اور چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے، سیدھا ہوا۔

"ٹھیک ہے۔ ولیم انھیں آزاد کر دو۔" اس نے حکم جاری کیا تو ولیم اسے بجالاتے، یاسمین کی ہتھکڑیاں کھولنے

لگا۔

تمام ملازماؤں نے آہِ سکون خارج کی جب کہ یاسمین اب بھی بے نیاز تھی۔

"اور مسٹر البرٹ، میں آپ سے آپ کے سرائے میں ملوں گا۔ میرا انتظار کیجیے گا۔" اس کے کان میں جھکتے وہ گویا ہوا۔ البرٹ خوش دلی سے سر اوپر نیچے ہلانے لگا۔

کام سے فارغ ہو کر ولیم اور جیمس چمنِ گلاب سے باہر نکل آئے۔

"اتنی آسانی سے جانے دیا؟" سڑک پر اپنے باس کی پیروی کرتے، ولیم بولا۔

"مجبوری تھی۔" وہ کہہ کر مسکرایا۔

مسکراہٹ مبہم، مگر فتنہ گر تھی۔

ولیم کی بھنویں اٹھیں۔

"آپ آخر کرنا کیا چاہتے ہیں؟"

جیمس مڑ کر ولیم کو دیکھتے کمینگی سے ہنس دیا۔

"بس دیکھتے جاؤ۔"

......☆☆☆......

یاسمین اپنی جگہ پر کھڑی، سرد نگاہوں سے البرٹ کو گھور رہی تھی۔ البرٹ لب بھینچ کر، اس کے چہرے کے زاویوں سے اس کے خیالات کو پرکھنا چاہ رہا تھا۔ اندر ہی اندر وہ جاننا چاہتا تھا کہ یاسمین اس سب کے بعد کیا کرے گی؟

جب کہ ارد گرد ملازمائیں خوش گپیوں میں مگن ہو گئی تھیں۔

"خوشیاں منانا بند کریں، آپ سب۔ کام کی طرف متوجہ ہوں۔ چلیں۔" وہ البرٹ کو گھورتے ہوئے بلند آواز بولی تو ملازماؤں کا شور چھٹنے لگا۔ سب کی سب یہاں وہاں منتشر ہوئیں۔

وہ ہاتھوں کو باندھ کر البرٹ کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ چال کسی ملکہ سے کم نہ تھی۔ البرٹ اب تک اندازہ لگانے میں کامیاب نہ ہوا تھا کہ وہ کیا کرنے والی تھی۔

وہ دونوں اب روبرو کھڑے تھے۔

وہ اسے یکسوئی کے ساتھ دیکھتے، سانسیں تھام کر اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ ذہنی طور پر دنگ ہونے کے لیے تیار تھا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس خوش فہمی کا شکار نہ ہوں کہ ہمیں اس سب کی ضرورت تھی۔" وہ کرخت سے انداز میں چبا چبا کر بولی اور کوئی جواب سنے بغیر بیکری کے اس مخصوص مقام پر چلی گئی جہاں سے گاہک لوازمات خریدتے تھے۔

البرٹ ساکت و جامد اس لڑکی کو دیکھتا گیا۔ اب کہ وہ گاہکوں سے نبٹ رہی تھی۔ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں حیرت تھی اور کڑواہٹ بھی۔ اسے اس لڑکی کا بے مروت انداز بری طرح کھل رہا تھا۔

دروازہ کھلا، اور گھنٹی کی آواز گونجی تو البرٹ نے جھٹکا لیا جیسے خواب چشمی کی حالت سے بیدار ہوا ہو۔

وہ نامحسوس انداز میں پیر پٹختے وہاں سے چلا گیا تھا۔

یہ پہلی بار تھا جب البرٹ ونسٹن چمنِ گلاب سے بنا کچھ خریدے گیا تھا۔

......☆☆☆......

تھانے کا کمرہ، مصنوعی روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ ہر سو ہر دم سکوت کا بسیرہ تھا۔ سکوت میں شر کی آمیزش تھی، یقیناً آج اس تھانے میں جمع ہونے والے انسان، بھلی نیت کے نہ تھے۔

سربراہی کرسی پر لوئیس براجمان تھے۔ میز پر ریتیلی گھڑی موجود تھی، جس میں سے ریت کے ذرات ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ایک حصے سے دوسرے حصے منتقل ہو رہے تھے۔ گویا مدت گزر جانے کی نشاندہی کر رہے ہوں۔

مگر یہ مدت گزر کس کے لیے رہی تھی؟

ان کے سامنے جیمس حاضر تھا۔

"سر، شاید مجھے فساد کی جڑ مل گئی ہے۔" جیمس کی بھوری آنکھیں چمکیں۔ لب دائیں طرف اٹھے۔

لوئیس کے لبوں پر مبہم، مگر پر اعتماد مسکراہٹ ابھری۔ آنکھوں میں ناز تھا۔

"مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی۔" وہ فخر سے بولے۔ "کون ہے وہ؟ اسے گرفتار کیوں نہیں کیا۔"

"سیدہ یاسمین مجاہد۔"

لوئیس کی بھنویں اٹھیں۔ چہرے پر ستائش پھیلی۔ اس نام نے انھیں چونکا دیا تھا۔

"چمنِ گلاب کی مالکن؟ وہ بیکر؟" دماغ یقین کرنے سے قاصر تھا۔

جیمس کے لبوں پر شاطر مسکراہٹ پھیلی۔ بھوری آنکھیں مکر آلود ہوئیں۔

"سر۔ اس دن، جو پامفلیٹ آپ نے دکھایا تھا مجھے اس میں شیرے کا داغ نظر آیا۔ اس میں بیکری کی مخصوص مہک بھی بسی ہوئی تھی۔ لہذٰا، مجھے شک ہوا کہ یہ کام کسی بیکری کے تحت ہو رہا ہے۔ میں نے تمام بیکریوں کی فہرست تیار کی، اور بار بار میرا دماغ چمنِ گلاب کی طرف جا رہا تھا۔"

لوئیس کو دیکھتے اس نے توقف کیا۔

"آخر کیوں؟"

گہری سانس خارج کرتے اس نے بات جاری رکھی۔

"سیدہ یاسمین مجاہد کی وجہ سے۔ وہ عورت کوئی معمولی عورت نہیں۔ پورا امرتسر اس کی عزت کرتا ہے۔ امرتسر کے مرد، اسے دیکھتے ہی نظریں جھکا لیتے ہیں۔ اس کی چال میں شجاعت ہے، اس سے بہتر لیڈر کوئی نہیں ہو سکتا۔"

لوئیس کا ماتھا شکن آلود ہوا۔

"مگر وہ ایک عورت ہے، جیمس۔" وہ بات سمجھنے سے قاصر تھے۔

اور واقعی، وہ ایک عورت ہی تو تھی؟ عورت جو اپنی قدر جانتی تھی۔ اپنی آزادی کی قدر جانتی تھی۔

"اسی لیے تو۔ وہ عورت ہے، ہمارا شک اس پر آج تک نہ گیا۔ وہ ایک بہترین ڈھال تھی۔ نہ جانے کتنے اجلاس اور احتجاج منعقد کروائے ہوں، اور ہمیں بھنک بھی نہ پڑی ہو۔"

لوئیس کا ماتھا صاف ہوا۔ چہرے کا تناؤ ڈھیلا ہوا۔ جیمس کی بات میں دم ضرور تھا۔

"تو تم مجھے سب کیوں بتا رہے ہو؟ اسے گرفتار کیوں نہیں کیا؟"

(راؤلیٹ ایکٹ کے مطابق، شک کی بنیاد پر، بغیر جاندار ثوابت کے، بغیر کسی وارنٹ کے، ہندوستانیوں کو گرفتار کیا جا سکتا تھا۔)

"میں آج چمنِ گلاب اسی سلسلے میں گیا تھا، اتفاقاً اس کے باہر مجھے ایک پامفلیٹ بھی مل گیا۔ میرے شکوک درست ثابت ہوئے۔ مگر پھر۔" جیمس کے چہرے پر ناگواری ابھری۔

"پھر البرٹ نے اس کے حق میں گواہی دی، اور مجھے اسے چھوڑنا پڑا۔"

"البرٹ ونسٹن؟" مقابل بیٹھے لوئیس کسی سوچ کے تحت بولے۔ "کیا تم البرٹ ونسٹن کی بات کر رہے ہو؟" لوئیس کو یہ بات قابلِ فکر لگی۔

جیمس نے سر اوپر نیچے ہلایا۔

"جی۔ فرینک ونسٹن کا اکلوتا بیٹا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ گرفتاری کے بعد وہ کوئی مداخلت کرے۔ اس کے والد کے پاس اثر و رسوخ ہے، ان کی ایک پکار پر یاسمین مجاہد کو باہر نکالا جا سکتا ہے۔" جیمس کے سفید ماتھے پر فکرمندانہ لکیریں نمودار ہوئیں۔

"مجھے تمھارے اوپر بھروسہ ہے، جیمس۔ تمھیں اس فسادی کو جلد از جلد سلاخوں کے پیچھے پہنچانا ہو گا۔ ان فسادی، دنگا کرنے والوں کا، ہماری عظیم ریاست کی تذلیل کرنے والوں کا آزادی کا کوئی حق نہیں ہے۔ آئی سمجھ؟" آواز میں دھمکی کا عنصر صاف ظاہر تھا۔

"پھر کیا تم نے کوئی تدبیر سوچی ہے؟"

جیمس نے سوال پر سر اثبات میں ہلایا۔

"جی سر۔ میں تدبیر سوچ چکا ہوں۔" لبوں پر مدھم سی عیار مسکراہٹ ابھری۔

لوئیس کی آنکھیں، مزید سننے کی خواہش ظاہر کرنے لگیں۔

"یہ لوگ چاہے جتنے مضبوط اور توانا کیو نکر نہ بن جائیں۔ ہمیشہ ان کے درمیان میر جعفر بستا ہے۔"

لوئیس کی آنکھوں میں شیطانی چمک در آئی۔ وہ جانتے تھے یہ گفتگو کس رُخ جا رہی تھی۔ وہ پوری محویت کے ساتھ جیمس کو سننے لگے۔

......☆☆☆......

("یہ لوگ چاہے جتنے مضبوط اور توانا کیونکر نہ بن جائے۔ ہمیشہ ان کے درمیان میر جعفر بستا ہے۔")

کچھ گھنٹے پہلے کے منظر میں لوٹ آتے ہیں۔

جب ولیم سیدہ یاسمین کی کلائیوں پر ہتھکڑیاں لگانے پر مصر تھا۔ تب جیمس، اپنی بھوری آنکھوں سے پوری بیکری کا معائنہ کر رہا تھا۔ لوازمات سے سجی میز سے لے کر، لکڑی کی کرسیوں سے لے کر، اس کی نگاہ ایک ایک ملازمہ پر ٹھہری۔ ہر ملازمہ کی آنکھ میں پریشانی تھی، خوف تھا۔ سوائے ایک کے۔

اسے اچھوتے سے خوشگوار احساس نے گھیر لیا۔

"کبوتر ہاتھ لگ چکا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

("ان لوگوں میں مصلحت پرست بستے ہیں، جو مواقعوں کے متلاشی ہوتے ہیں۔ جہاں موقع ملے، وہاں اپنا اصلی چہرہ ظاہر کر جاتے ہیں۔")

امر تسر پر تاریکی کا غلبہ تھا۔ وہ ایک کالونی میں کھڑا، چہل قدمی کر رہا تھا۔ گھروں کے باہر لگے دیوں نے اس گلی کو منور کیا ہوا تھا۔

دفعتاً اسے وہی چہرہ نظر آیا۔ اس چہرے کو دیکھتے ہی، بھوری آنکھیں چوکنّا ہوئیں۔ اپنی ازلی چال چلتے، وہ اس کے پاس جا پہنچا۔ فریب کے بیج بونے والے اس مرد کی آنکھوں میں فخر سمایا ہوا تھا۔

("تاریخ گواہ ہے، جب جب یہ فتح کے قریب پہنچے ہیں، ان کے اپنے ہی لوگوں نے انھیں مار گرایا ہے۔")

اپنی طرف اس برطانوی مرد کو آتے دیکھ کر وہ سہم گئی۔

اس راتِ تاریک میں، گلی ویران تھی۔ اسے اپنی عزت، اپنی جان و امان کا خوف ستانے لگا تھا۔

انگیزشِ عدل

"ڈرومت۔ میں نقصان پہنچانے کی نیت سے نہیں آیا۔" اس نے ہاتھ ہوا میں بلند کرتے کہا۔ آگ کے شعلوں کی زرد روشنی میں اس کے لبوں پر پھیلی شگفتہ مسکراہٹ واضح ہوئی۔

وہ خاموش رہی۔ مگر پرسکون اب تک نہ ہوئی تھی۔ وہ سفید کھال والا تھا۔ سفید کھالوں والوں پر ہندوستانیوں کا بھروسہ کرنا حرام ٹھہرا تھا۔

("مجھے بھی شاید، ایک ایسا انسان مل گیا ہے، سر۔")

"میں سیدھا مدعے پر آتا ہوں۔ کیا تم مجھے چمنِ گلاب کا وہ راز بتاؤ گی، جس پر پردہ رکھنے میں تمھاری مالکن کوشاں ہے؟" اس نے انداز دوٹوک رکھا۔

مقابل کھڑی عورت کی آنکھیں درشت ہوئیں۔

"آپ میرا راستہ نہ روکیں۔ میں آپ کو کچھ بھی بتانے کی قائل نہیں۔" وہ اسی کے انداز میں بولی۔

جیمس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"کیا سونے کے زیورات بھی تمھارا منہ نہیں کھولیں گے؟" انداز ذومعنی تھا۔

مقابل کھڑی لڑکی خاموش پڑ گئی۔

یکدم اس نے قدم پیچھے بڑھائے۔ دیوں کی زرد روشنی میں اس کا گندمی چہرا نمایاں ہوا۔

"کتنے دے سکتے ہو؟" روشی کے گندمی چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

("ان لوگوں کو ہم سے زیادہ، اپنے ہی لوگوں سے خطرہ لاحق ہے۔")

......☆☆☆......

کام سے فارغ ہو کر یاسمین چمنِ گلاب سے باہر نکلی ہی تھی کہ اس کی نگاہیں، شہد رنگ آنکھوں والے مرد پر ٹکیں۔ سیاہ آنکھیں ناگواری سے بھڑکیں۔ وہ سر جھٹکتے، اس کے سامنے سے ایسے گزر گئی جیسے اسے دیکھا بھی نہ ہو۔

البرٹ اس کا طرزِ عمل دیکھ کر، لب بھینچتے رہ گیا۔ ضبط کے گھونٹ بھرتے وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔

"لیڈی یاسمین! کیا آپ مجھ سے بات کر سکتی ہیں؟" وہ اس کے عقب میں چلتے، اس کی رفتار کا مقابلہ کر رہا تھا۔

سانسیں پھولنے لگی تھیں۔

"اگر آپ ہماری رفتار کا مقابلہ کر پائیں، تو ضرور۔ ہم راہ چلتوں کے لیے رکنے کے عادی نہیں۔"

البرٹ کے برعکس اس کی سانسیں قابو میں تھیں۔

البرٹ نے اکتاہٹ آمیز سانس خارج کی۔ انسان بے مروت ہو، لیکن یاسمین جتنا نہ ہو۔ اس نے دل ہی دل میں تبصرہ کیا۔

"مجھے علم ہے کہ وہ پامفلیٹ کسی گاہک کا نہیں تھا۔ اگر ہوتا، تو مجھے یقین ہے آپ یا ملازمائیں گواہی دیتیں۔"

اس نے سوچا تھا کہ یاسمین پر جب یہ بات منکشف ہو گی تو وہ کوئی ردِ عمل دے گی۔ مگر یاسمین کی بدستور رفتار، اکڑی گردن، اور پر اطمینان چہرہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا، کہ وہ سیدہ یاسمین مجاہد کو ذرہ برابر بھی نہیں جانتا۔

"اور میں آپ کے علم سے باخبر ہوں۔" آواز میں دبا دبا تمسخر تھا۔

البرٹ کے اوپر حیرت کا جھٹکا لاحق ہوا۔ پھر اس لڑکے کی روکھے سے انداز نے اس کا مزید خون جلایا۔ شکر گزار ہونا کیا اتنا مشکل ہوتا ہے؟ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے، بہت کچھ سوچتا گیا۔

"براہ مہربانی اتنے خطرے مول نہ لیں، لیڈی۔ حکومت نے پابندیاں عائد کی ہیں۔ یوں آپ، اور آپ کے عملے کے لیے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔" وہ اس کے ہم قدم چلتے، پھولتی سانسوں کے درمیان اٹک اٹک کر بولا۔

یاسمین نے چند ساعتوں کے لیے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔ چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی جس کے توسط، گرما گرم خون البرٹ کے دماغ میں جالگا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تھا۔ وہ نہ جانے کیوں اس خودسر لڑکی کی بھلائی چاہ رہا تھا؟ تنبیہ کرنے کے اس عمل پر، اس نے خود کو ملامت کیا۔

"ہم آپ کے مشورے کے لیے مشکور ہیں۔" آواز میں دبی دبی تضحیک تھی۔

البرٹ کا چہرا اُسرخ ہوا۔ ضبط اپنی آخری سطح پر تھا۔ کوئی کھڑوس ہو، لیکن یاسمین جتنا کھڑوس نہ ہو۔ ایک بار پھر اس نے دل ہی دل میں تبصرہ کیا۔

"میری بات کھلے دماغ سے سمجھیں، لیڈی یاسمین۔" وہ گہری سانسیں لیتے، آواز میں کوفت اور ناگواری لیے

بولا۔ ”میں نے آپ کو بھلائی کی خاطر متنبہ کرنا چاہا۔ اس دن جب آپ کو یوں بے سہارا عورتوں کی مدد کرتے دیکھا، تو میں نے یہ جان لیا تھا کہ آپ ایک بھلی انسان ہیں۔ اور بھلے لوگوں کے ساتھ بھلا کرنا چاہیے۔

اگر حکومت نے پابندی نافذ کی ہے تو ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ ان پابندیوں کا احترام کریں۔ اور مجھے آپ ہندوستانیوں کی یہ منطق اب بھی سمجھ نہیں آتی کہ، جانتے بوجھتے کہ یہ عمل آپ سب کو نقصان دے گا، آپ وہی عمل کر گزرتے ہیں۔ ہاں ٹھیک ہے حکومت نے ناحق ظلم ڈھائے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں آپ پورا شہر اپنے سر پر اٹھا کر اپنی ذات کو نقصان پہنچائیں، وہ بھی ایک مسخ شدہ خلافت کے لیے؟“ غصے کے باعث، اس کی زبان پر جو الفاظ امڈ ائے وہ بولتا چلا گیا۔

یاسمین رک گئی۔ اس نے مڑ کر البرٹ کی شہد رنگ آنکھوں کو دیکھا جن میں دبا دبا اشتعال تھا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندھیں جھلک رہی تھیں اور سانسیں چڑھی ہوئی تھیں۔

”ہم آپ کے متنبہ کرنے کے اس کریمانہ عمل پر بھی دل سے شکر گزار ہیں۔“ اس نے طنز کسا تو البرٹ نے بھنویں سکیڑیں، اور غیر دانستہ گردن جھٹکی۔ یاسمین نے کلام کا سلسلہ جاری رکھا۔

”اور یہ جان کر اچھا لگا کہ، آپ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کی حکومت نے ہمارے اوپر بے جا ظلم ڈھائے ہیں۔ لہذا آپ ہمارے اس سوال کا جواب دینا پسند کریں گے کہ، آپ ہندوستان میں کتنے عرصے سے قیام پذیر ہیں؟“ سرد انداز میں ادا ہونے والا سوال البرٹ کے لیے غیر متوقع تھا۔

وہ پلک جھپکاتے، کچھ دیر اس کا سوال پوچھنے کا مقصد بوجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ گرد و نواح میں گھروں سے نکلتا ہلکا پھلکا سا شور ان کے کانوں سے ٹکرا رہا تھا۔

”ہندوستان آئے مجھے دو سال سے زائد بیت چکے ہیں۔“ مگر افسوس، وہ سیدہ یاسمین کو نہیں جانتا تھا، اور یہ اندازہ لگانے میں ناکام ٹھہرا تھا کہ یاسمین یہ گفتگو کس سمت لے جا رہی ہے۔

جواب سن کر، یاسمین تمسخرانہ انداز میں زیر لب ہنس دی۔ البرٹ کی آنکھوں میں ناگواری ابھری۔ وہ لڑکی اپنی آنکھوں سے ہی اس کی خوب عزت افزائی کر رہی تھی۔

"آپ کو یہاں آئے صرف دو سال بیتے ہیں۔ تاہم ہماری آپ سے یہی گزارش ہو گی کہ ہم ہندوستانیوں کو مشورے دینے سے گریز کریں۔ ہم ایک عمر اس دیس میں نہ جانے کن کن دشواریوں کا سامنا کرتے کاٹ چکے ہیں۔ آپ نہیں جانتے ہم ہندوستانی اپنی آزادی کے لیے، اپنے حقوق کے لیے کتنے جتن کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے آپ سے کسی قسم کی توقعات وابستہ نہیں کی ہیں۔ چاہے جتنے بھی باادب کیوں نہ ہوں، نسل کا اثر تو منتقل آپ میں بھی ہوا ہو گا۔" آنکھوں میں حقارت تھی۔ آخری جملہ چبا چبا کر ادا کیا۔

البرٹ کا اب ضبط بری طرح سے جواب دے گیا تھا۔ یہ حملہ ضرورت سے زیادہ ذاتی اور پیچیدہ تھا۔ اس نے غلطی کی جو کبھی اس لڑکی کے لیے خیر چاہی، اس کی بھلائی کے بارے میں کچھ سوچا بھی۔ وہ جس قدر تضحیک سے اس سے مخاطب ہو رہی تھی، اس نے البرٹ کے دماغ میں بنایا یاسمین کے لیے وہ اچھائی کا خاکہ پاش پاش کر دیا تھا۔ بس اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا، کہ وہ مروت کی دیوار کو گرا ڈالے گا۔

"مجھے آپ لوگوں کی سمجھ نہیں آتی ہے۔" وہ غضب کے عالم میں بولا۔

یاسمین کی آنکھوں میں تپش بڑھ گئی تھی۔ تکرار نیا رنگ لے رہی تھی۔ مقابل جل رہے تھے، اور ایک دوسرے کو جلانا بھی چاہتے تھے۔

"ایک طرف آپ سب کہتے ہیں کہ ہم برٹش مغرور قوم ہیں، اور دوسری طرف مجھے آپ اس طرح نیچی نگاہ سے دیکھتی ہیں، نفرت اور حقارت کا نشانہ بناتی ہیں اور تو اور میری نسل تک پر انگلی اٹھاتی ہیں۔ یہاں پر مغرور میں ہوا یا آپ؟ جواب دینا پسند کریں گی، لیڈی یاسمین؟" وہ کڑوے کسیلے لہجے میں بولا تو یاسمین کی آنکھوں سے مزید شعلے پھوٹے۔

"ہم نے آپ کو کچھ مختلف جانا تھا، لیکن آپ اپنی ہر بات سے یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ آپ کو مختلف جان کر ہم نے بہت بڑی کوتاہی کی ہے۔" اس کی کوئی بات بنا طنز کے شروع نہ ہونے والی تھی۔

بہر حال، اس نے البرٹ کو جتاتی گھوری سے نوازتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"جی بالکل، ہماری نظروں میں آپ سب کے لیے حقارت ہے، نفرت ہے۔ لیکن کبھی سوچا ہے کیوں؟ یہ بے

انگیزشِ عدل

عزتی آپ لوگوں کی خود کی کمائی ہوئی ہے، مسٹر البرٹ۔ لیکن آپ رہنے ہی دیں۔ اتنا کھرا سچ سننے کا آپ میں حوصلہ نہیں ہے، اگر سن لیا تو اسے قبول نہیں کر پائیں گے۔ قبول کر لیا تو اسے برداشت نہیں کر پائیں گے۔" وہ اس کی طرف انگشتِ شہادت اٹھاتے ہموار لہجے میں بولی۔ نظروں میں کاٹ تھی، تنبیہ تھی۔ وہ آنکھیں جیسے البرٹ کو مزید کچھ کہنے کے لیے اکسا رہی تھیں۔

"واہ واہ۔" البرٹ نے طنزاً تالیاں پیٹیں۔ "بس؟ کچھ لوگوں کی زیادتیوں کا ذمہ دار آپ نے پوری قوم کو ٹھہرا دیا؟" وہ استہزاء کا شکار ہونے لگا تھا۔

پہلے وہ لڑکی، کچھ حد تک برداشت ہو جاتی تھی، مگر اب وہ لڑکی ناقابلِ برداشت بن گئی تھی۔

"ویسے بھی، میں نے تو آپ کا بھلا ہی چاہا تھا۔ میری نیت صاف تھی اس لیے آپ کو خبردار کرنے کی حماقت کر بیٹھا۔ برا لگا ہو تو معافی چاہوں گا۔" اس کی آواز اداس ہو گئی تھی جیسے یاسمین کے رویے سے اس کا دل پسپا ہو چکا ہو۔

مگر اس اداسی، اس جذباتی فقرے نے یاسمین کے اوپر کوئی اثر نہ کیا۔ الٹا اس کی نظروں میں پنپتی آگ جنون کی حد تک شدت اختیار کر چکی تھی۔

"دیکھیں۔ آپ نے پھر سے ہماری باتیں درست ثابت کر دیں۔ آپ سب کو یہی لگتا ہے کہ آپ ہمارے اوپر احسان کر رہے ہیں، ہمارے ساتھ بھلائی اور اچھائی سے پیش آ رہے ہیں۔ آپ سب خود کو ہمارا مسیحا مانتے ہیں۔ کیا ہم غلط ہیں؟" وہ ہاتھ باندھ کر بولی۔

البرٹ نے بے بسی بھرے غصے سے لب بھینچے۔ وہ کچھ الٹا سیدھا کہنے سے خود کو روک رہا تھا۔ کون بتائے اس سفید مرد کو کہ وہ پہلے ہی بہت کچھ الٹا سیدھا کہہ چکا تھا۔

"تو کیا یہ سچ نہیں؟ آپ کے دیس میں ہم نے ریلویز بنا کر دیے۔ آپ لوگوں کے دیس ہم ٹیلی فون لے کر آئے۔ آپ لوگوں کو کاروباری فوائد دیے۔ ہم نے ستی پر پابندی لگائی۔ وہ ظالم روایت جس میں بیوہ کو اسی کے شوہر کے ساتھ زندہ جلایا جاتا تھا۔ اس سب کو آپ پل بھر میں بھلا دیں گی؟" وہ اب اسے نہیں چھوڑنے والا تھا۔ بہت برداشت کر لیا تھا اس نے، بہت سہہ لی تھی اس نے تذلیل۔ اگر وہ ضدی تھی تو وہ بھی اسی کا مقابلہ کرے گا۔

یاسمین قہقہہ بلند کرنے لگی جیسے البرٹ نے کوئی لطیفہ عرض کر دیا ہو۔

اس لڑکی کا ایک ایک عمل، ایک ایک انداز البرٹ کو کھل رہا تھا۔

"ریلویز۔ واہ۔ وہی ریل گاڑیاں ناں، جو آپ نے اس لیے بنوائیں تھیں تا کہ ہم لوگ اپنے دور دراز رشتہ داروں سے مل سکیں؟ لیکن آپ کو ہم بتائیں کہ وہ کس مقصد کے لیے استعمال ہو رہی ہیں؟ ان ریل گاڑیوں میں وہی ہتھیار بھر بھر کے پورے ہندوستان گھومتے ہیں جن سے ہندوستانیوں کا آج سرِ عام قتل ہو رہا ہے!" وہ دانت پیس کر بولی تو البرٹ کی رنگت بھک سے اڑ گئی۔ چہرے پر پھیلا تناؤ کچھ کم ہوا۔

"ٹیلی فون؟" وہ استہزائیہ ہنس دی۔ "آپ لوگوں کا احسان، آپ ہمارے دیس میں ٹیلی فونز لے کر آئے۔ معلوم ہے وہ ٹیلی فونز کون استعمال کرتا ہے؟ آپ کے یہ افسران! ایک دوسرے کو مطلع کرتے ہیں کہ ہمیں اس شہر میں لوگ چاہیے تا کہ ان احتجاجیوں کی لگامیں کھینچ سکیں۔"

وہ سچ کہہ رہی تھی۔ یاسمین نے درست ہی تو کہا تھا۔ وہ سچ سن تو سکتا تھا، لیکن سچ قبول کرنا بہت کٹھن تھا۔ اگر قبول کر لیتا تو اسے برداشت کیسے کرتا؟ اس کی گردن شرم سے جھک گئی۔ دل میں یاسمین کا مقابلہ کرنے کا جو عزم تھا وہ جھاگ ہو چکا تھا۔

"اور یاد دلائیں آپ لوگوں نے ہمارے کپڑوں کے بیوپار کا کیا حشر کیا؟ یہاں سے سارا را کاٹن لے جاتے تھے اور اپنے ملک میں کپڑے بنا کر ہمارے ہی ملک میں بیچتے تھے۔ آپ لوگوں کی وجہ سے کتنے بھلے بھلے خاندان سڑکوں پر آ گئے تھے۔

اور کیا کیا گنوائیں ہم؟

اور عظیم جنگ کا عظیم دھوکہ، دغا یاد کروائیں؟ کیسے ہم مسلمانوں کو دھوکہ دیا گیا؟ کیسے ہمیں یقین دلایا گیا کہ سلطنتِ عثمانیہ کو نہیں توڑا جائے گا اور آج وہ لوگ پورے شوق و ذوق سے اپنی زباں سے پھر چکے ہیں۔ اور آپ کو یاد دلائیں ان جانوں کے بارے میں؟ دنیا بھر میں آپ کی حکومت نے لاتعداد مسلمان سپاہیز کو مارا ہے۔ اور کون سی بھلائیاں جاننا چاہیں گے اپنے لوگوں کی، مسٹر البرٹ؟ باخدا ساری رات احسانات گنواتے گنواتے گزر جائے گی، مگر یہ

فہرست ختم نہ ہو پائے گی۔" اس کی آواز تکلیف کے مارے کپکپانے لگی۔ اس نے سانس لینے کو توقف لیا اور البرٹ کو دیکھا جو کہ اب اس سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔

بلاشبہ، اس لڑکی نے اسے لاجواب چھوڑ دیا تھا۔ شہد رنگ آنکھیں اپنی ہار تسلیم کر چکی تھیں۔

"ہاں ہمیں اس حکومت سے نفرت ہے۔ اور ہمیں اس نفرت پر فخر محسوس ہوتا ہے۔ مجھے آپ کچھ مختلف لگے تھے لیکن آپ نے ثابت کر دیا کہ سارے برٹش ایک جیسے ہوتے ہیں۔

اور جہاں بات ہے ان پامفلیٹس کی، ان پرائیویٹ گیدرنگز کی تو وہ بھی ہم تر شان کریں گے! ہم کریں گے احتجاج، ہم نعرہِ حق بلند کریں گے۔ ہم اپنی آزادی کے لیے، اس مٹی سے وفا کی خاطر ہر حد پار کر سکتے ہیں مسٹر البرٹ، اور کوئی ہمیں نہیں روک سکتا۔ اور پتہ ہے یہ سب ہم کیوں کر رہے ہیں؟"

البرٹ نے اب کی بار نظر اٹھا کر یاسمین کو دیکھا جس کی آنکھوں میں تکلیف اُمڈ آئی۔ چہرے پر تکان تھی۔ البرٹ نے ترنت ہی نظریں چرا لیں۔ وہ ان آنکھوں میں زیادہ دیر دیکھنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔

"تاکہ آئندہ نسل وہ نہ دیکھے جو تیرہ اپریل کو ہم سب نے جلیاں والا باغ میں دیکھا تھا!" سیاہ آنکھوں کے گوشے نم ہوئے۔ لیکن اس نے آنسوؤں کو بہنے سے روک لیا۔

البرٹ ونسٹن کے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ یاسمین کی آواز میں تڑپ اور تکلیف کے ولولے نے اسے اندر تک دہلا دیا تھا۔

"اور جسے آپ مسخ شدہ خلافت کہتے ہیں، وہ ہم برِ صغیر کے مسلمانوں کی شان ہے! دنیا بھر میں مسلمان نو آبادی کا شکار ہیں، دنیا بھر میں ہمیں مارا جا رہا ہے۔ ہمارا آسرا پتہ ہے کون ہے؟ وہی مسخ شدہ خلافت۔ ہمارے پُرکھوں نے خلیفہ سے ہمیشہ وفا کی ہے۔ جب روسی جنگ ہوئی تھی تب برِ صغیر کے مسلمانوں نے انھیں بھاری تعداد میں امداد فراہم کی تھی۔ ہمارے مرد جنگ لڑنے گئے تھے۔ ہم نے صدیوں سے وفا نبھائی ہے، اور آج جب خلافت اپنے سب سے کمزور لمحات میں ہے، ہم اسے کیسے چھوڑ جائیں؟ وہ پابندیاں عائد کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔ ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ خلافتِ عثمانیہ برِ صغیر کے مسلمانوں کی وہ دکھتی رگ ہے، جسے چھیڑ کر ان لوگوں نے بہت بڑی خطاء کر ڈالی ہے۔ لیکن

نہیں، آپ کبھی کچھ نہیں سمجھیں گے۔ یہ باتیں سمجھنے کے لیے جگر اچاہیے ہوتا ہے۔ قابض اور لٹیروں میں وہ کہاں ملتا ہے؟"

وہ کہہ کر دو قدم پیچھے ہوئی۔ سانسیں تیز ہوئی تھیں۔ جسم جیسے تھک ہار چکا تھا۔ اب کچھ کہنے کی اس میں سکت نہ رہی تھی۔

البرٹ بدستور گردن جھکائے کھڑا رہا۔ آج وہ خود کی نظروں میں بری طرح گر گیا تھا۔ یاسمین سانس بحال کر کے وہاں سے چلی گئی اور کسی گلی میں گم ہوگئی۔

اس نے سر جھٹک کر واپسی کی راہ پر چلنا شروع کیا۔

اسے اپنے آپ پر شرم محسوس ہو رہی تھی۔ کیسی شان سے اس نے کہا تھا کہ وہ لوگ حکومت کے احکامات کا احترام کریں، جب کہ اسی حکومت نے ان کا کوئی احترام نہ کیا۔ ان کے جذبات کے ساتھ موت کا بھیانک کھیل کھیلا۔ پھر وہ ایسی باتیں کیسے کہہ سکتا تھا؟ اسے اپنا ہر ایک لفظ یاد تھا اور ہر ایک لفظ پر وہ تہِ دل سے نادم تھا۔

دفعتاً سماعت میں ایک دل خراش چیخ گونجی تو اس کے حواس چوکنّا ہوئے۔ دماغ میں خون کی روانی بڑھ گئی۔ وہ اس چیخ کا تعاقب کرتے ایک گلی میں پہنچا اور اس منظر کو دیکھ کر اس کا دل برق رفتاری سے دھڑکنے لگا تھا۔

یاسمین کو نقاب پوش مرد نے دیوار سے لگایا ہوا تھا اور اس کا چہرا اپنے ہاتھ میں دبوچا ہوا تھا۔ وہ اس کی گرفت سے آزادی حاصل کرنے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی۔ البرٹ کی سانسیں تیز ہوئیں۔ بغیر کچھ سوچے، وہ اس نقاب پوش آدمی کی جانب بڑھا اور اس کے جبڑے پر زوردار مکا جڑ دیا۔ اس کی خد و خال سے اتنا تو ظاہر تھا کہ وہ کوئی ہندوستانی تھا۔

یاسمین اس کی گرفت سے آزاد ہوئی تو گھٹنوں کے بل زمین پر جا گری۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور حواس شل تھے۔ پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔

البرٹ اسے ایک اور مکا مارنے ہی لگا تھا کہ نقاب پوش مرد نے اس کے ہاتھ کو جکڑا اور اس کے چہرے پر جوابی مکا دے مارا۔ مکا اتنا زوردار تھا کہ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ البرٹ نے اپنی پوری زندگی میں اس سے زیادہ زوردار

مکانہ کھایا تھا۔ وہ آدمی البرٹ سے کئی گنا طاقتور ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے البرٹ کو بالوں سے پکڑا اور اس کا سر دیوار سے دے مارا۔ البرٹ کے سر سے خون بہنے لگا۔ دائیں ہاتھ سے بالوں کو جکڑے، اس نے بائیں ہاتھ سے البرٹ کے جبڑے پر ایک اور مکا دے مارا۔ البرٹ سے یہ وار برداشت نہ ہو پایا اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ گلی اس برطانوی مرد کی چیخ و پکار سے گونج اٹھی۔

اب وہ البرٹ کے پورے جسم پر لاتیں برسا رہا تھا۔ البرٹ تکلیف سے کراہتا، چلاتا، لیکن اس آدمی کو اس پر کوئی رحم نہ آیا۔ پل بھر تو البرٹ کو بھی یہی لگا کہ آج وہ زندہ بچ نہ پائے گا۔

پل بھر یاسمین کو ہوش آیا۔ اسے البرٹ کی چیخ و پکار سنائی دی۔ پھر اس مرد کی زیر لب بڑبڑائے جانے والیں گالیاں سنائی دیں۔ اس نے اپنی پلکیں کھولیں تو جسم میں یکدم پھرتی بھر گئی۔ وہ آدمی البرٹ کو زور و شور سے ٹھڈے مار رہا تھا۔ جب کہ البرٹ تڑپنے اور بلکنے کے سوا کچھ نہ کر رہا تھا۔

یاسمین ہڑبڑا اٹھی۔ اگر وہ جلد کچھ نہ کرتی تو شاید اپنی آنکھوں کے سامنے خون ہوتا دیکھ لیتی۔ یکدم اس کی نظر، برابر میں پڑی لکڑی کے ڈنڈے پر پڑی۔ دل پسلیوں سے آزاد ہو جانے کو تھا۔ اس نے اپنی رفتار پکڑتی دھڑکنوں، اور گہری سانسوں کے درمیان وہ ڈنڈا اٹھاما۔ کھڑی ہوئی اور پوری قوت سے اس مرد کے سر کی پشت پر وار کیا۔ وہ مرد جھٹکا کھاتے زمین پر ڈھے گیا۔

یاسمین کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ گیا۔ پھیلی ہوئی آنکھیں اس نقاب پوش مرد سے ہوتے ہوئے اس سفید، زخمی کراہتے ہوئے مرد پر ٹکیں۔

اس کا چہرہ زخموں سو چور تھا۔ کوٹ کی آستینیں جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھیں۔ پینٹ پر اور کمر کے پاس خون کے داغ بھی تھے۔ وہ درد کے مارے بلبلا رہا تھا۔

یاسمی ن کے حلق سے چیخ ادا ہوئی۔ اس نے غیر دانستہ طور ہاتھ لبوں پر رکھ دیا۔ اس منظر نے اسے بے سدھ چھوڑ دیا تھا۔

اسی وقت گلی کے کونے سے ایک عمر رسیدہ جوڑا نمودار ہوا۔ دونوں میاں بیوی تھے اور برابر والی گلی سے، شور کا

تعاقب کرتے یہاں آ گئے تھے۔

اس سفید مرد کو زخمی دیکھ کر دونوں کچھ حیران ہوئے اور پھر انھوں نے خوف و دہشت سے کپکپاتی ہوئی یاسمین کو دیکھا۔ دونوں کو طرح طرح کے خدشات ستانے لگے۔

"یاسمین۔ یہ کیا ہوا ہے؟" عمر رسیدہ مرد اپنے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرتے بولے۔

"تنویر چچا۔ ایک بدمعاش ہمارے پیچھے لگ گیا تھا اور پھر یہ ہمیں بچانے آئے۔ اسی سلسلے میں ان کا یہ حال ہو گیا۔" اس نے گہری گہری سانسیں لیتے انھیں سب بتایا۔ ہر وقت سرد اور سپاٹ رہنے والی یاسمین آج اپنے حواسوں پر قابو نہ کر پائی۔

"میں اس بدمعاش کو تھانے چھوڑ کر آتا ہوں اور یاسمین، تم قدسیہ کے ساتھ اسے گھر لے کر جاؤ اور اس کی مرہم پٹی کرو۔" انھوں نے یاسمین کی حالت دیکھی تو خود ہی ایک حل تجویز کیا۔

یاسمین بدحالی کے عالم میں گردن اوپر نیچے ہلانے لگی۔ تنویر صاحب اس نقاب پوش مرد کو کندھوں سے اٹھا رہے تھے جب کہ دونوں خواتین زخمی البرٹ کی طرف بڑھیں جو کہ درد کی شدت سے اب تک کراہ رہا تھا۔ اس کے آس پاس فرش پر بھی خون کے داغ لگ گئے تھے۔

یاسمین کا دل یکدم بھاری ہو گیا تھا۔ البرٹ کی حالت کا زمہ دار وہ خود کو ٹھہرا رہی تھی۔

......☆☆☆......

یہ گھر کا اضافی کمرہ تھا۔ جو کہ چھوٹا مگر پرسکون تھا۔ کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی معدوم تھی۔ تنویر صاحب تھانے سے لوٹ آئے تھے اور قدسیہ اور یاسمین کے سرہانے موجود تھے۔

البرٹ بستر پر دراز سا لیٹا، نیند کی وادیوں میں گم تھا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔

"اللہ کا شکر ہے کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا اور وقت پر سب ٹھیک ہو گیا۔" تنویر صاحب مدبرانہ انداز میں بولے۔

یاسمین اب بھی کھوئے ہوئے عالم میں زخمی البرٹ کو دیکھ رہی تھی اور نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ البتہ،

اپنے حواسوں پر وہ قابو پا چکی تھی۔

"نسل کا اثر تو منتقل ہوا ہو گا۔۔" اسے اپنے الفاظ یاد آئے۔ وہ الفاظ اب اس کے حلق میں چبھ رہے تھے۔

وہ غصے میں آکر اسے کیا کیا بول گئی تھی؟ قابض، لٹیرا اور پتہ نہیں کیا؟ اور وہ؟ وہ اس کو بچانے کے عوض مرتے مرتے بچا۔ یاسمین کو فضا ثقیل محسوس ہوئی۔ سینے پر بوجھ آن وارد ہوا۔ وہ خود کو زمین کی گہرائیوں میں دھنستا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

زبان کے دیے گئے گھاؤ سب سے گہرے اور تکلیفدہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ سیدھا روح پر وار کرتے ہیں۔ روح کے زخم بھر بھی جائیں تو، بھلائے نہیں جاسکتے۔

"یاسمین بیٹی، تم جانتی ہو یہ گلی ویران ہے تو رات کے پہر اکیلے نہ گزرا کرو۔ کسی ملازمہ کے ساتھ آیا کرو یا مغرب سے قبل آجایا کرو۔" قدسیہ کا لہجہ متفکر تھا۔

یاسمین نے سوچوں میں غرق ہی سر اثبات میں ہلایا۔

"جی۔ ہم ضرور کوئی حل نکال لیں گے۔ آئندہ کے لیے محتاط رہنا ضروری ہے۔" آواز بھاری اور کھوئی کھوئی معلوم ہوئی۔

تنویر اور قدسیہ کی نگاہیں ملیں۔ دونوں اس کی بدحالی سے واقف تھے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ بس اللہ کا شکر سب ٹھیک ہو گیا۔ اب آگے بڑھتے ہیں۔ قدسیہ آپ یاسمین کے ساتھ قیام کر لیں۔ کل صبح آجایئے۔ یاسمین اپنا دھیان رکھیں اور کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں۔" وہ نظریں نیچی کر کے لہجے میں احترام لیے بولے۔

"آپ کا بہت شکریہ۔" وہ البرٹ کی بند آنکھوں کو ہی تکتے ہوئے بولی۔

وہ ادب سے سر کو خم دیتے رخصت ہو لیے۔

"چلو یاسمین۔ بتی بجھا کر باہر آجاؤ۔"

یاسمین ان کی بات پر چونک سی گئی۔ اس نے شمع بجھا دی اور خود قدسیہ کے ساتھ لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گئی۔

اب بھی وہ کھوئی کھوئی سی، دنیا سے منقطع لگ رہی تھی۔ قدصیہ کی تشویش میں اضافہ ہوا۔

”کیا ہوا یاسمین؟ تم کچھ زیادہ پریشان لگ رہی ہو۔ سب ٹھیک ہو تو گیا ہے۔“ وہ اس کے برابر میں بیٹھیں۔ اس کا گندمی ہاتھ اپنی گود میں رکھتے کستی سے تھام لیا۔

”اس کے جسم کے زخم بھلے ٹھیک ہو جائیں۔ ان زخموں کا کیا جو روح پر لگائے ہیں ہم نے؟“ اس نے نادم سے لہجے میں کہتے گہری سانس لی۔

قدسیہ الجھیں۔ ”کیسے زخم؟“

اور یاسمین نے جواباً سارا واقعہ ان کے گوش گزار کیا۔ قدسیہ نے تحمل سے ساری باتیں سنیں۔

”بتائیں؟ کیا یہ سب کہنا چاہیے تھا ہمیں؟ ہماری لڑائی تو ان افسروں سے ہے۔ ان viceroys سے ہے جو ہمیں اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں۔ جو ہماری آواز ہماری آزادی ہم سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ اور ہم نے کیا کیا؟“ چہرے پر استہزاء بکھری۔

”ہم نے تو ساری بھڑاس اس پر نکال دی۔ ہم اتنے احمق کیسے ہو سکتے ہیں؟“ اس نے ہاتھ مٹھی میں بھینچتے، کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

”غلط تو ہوا ہے، یاسمین۔ فاصلہ رکھنا، احتیاط کرنا ضروری ہے۔ مگر کسی کو بے بنیادی باتوں پر نفرت کا نشانہ بنانا عقلمندی نہیں۔“

”پھر ہم کیا کریں؟ ہم بہت شرمندہ ہیں۔“ اس نے التجائیہ نظروں سے قدسیہ کو دیکھا، گو کہ ان سے حل مطلوب کرنا چاہتی ہو۔

”معافی۔ معافی مانگو۔ یہ معافی ہی تمھارے دل کو ہلکا کر دے گی۔ جس زبان سے اس پر وار کیا ہے، اسی زبان سے معافی بھی مانگو۔“ انھوں نے گردن اوپر نیچے ہلا کر، پیش کش دی۔

یاسمین کھوئے کھوئے سے عالم میں سیدھ میں دیکھنے لگی۔ سر خود بہ خود اثبات میں ہل گیا۔

وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ وہ جب تک البرٹ سے اپنے تلخ رویے کی معافی طلب نہ کر لیتی اسے سکونِ

انگیزشِ عدل

قلب عطا نہ ہوناتھا۔ اس نے علی الصبح ہی البرٹ ونسٹن سے معافی مانگنے کا ارادہ کیا۔

......☆☆☆......

کھڑکی کے ذریعے دھوپ اس کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ بھورا فرنیچر اب کہ سنہرا دکھائی دے رہا تھا۔ کرنوں کی تپش نے اسے نیند سے بیدار کیا۔ اس نے پلکوں پر زور دیتے اپنی آنکھیں کھولیں۔

اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اسے کچھ بھی یاد نہیں آرہا تھا۔ انجانی سی جگہ دیکھ کر وہ ہربڑا کر حرکت کرنے لگا کہ جسم میں تکلیف کی زوردار لہر ابھری اور وہ سسک جاری کرتے پھر سے لیٹ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے بدن میں جگہ جگہ پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا جا رہا ہو۔

اس نے خود کو ایک نظر دیکھا۔ جسم پر جگہ جگہ پٹیاں بندی ہوئی تھیں۔ اس نے گردونواح میں نظریں دوڑائیں۔

یکبارگی اس کی یادوں نے ذہن کے خانوں پر دستک دی۔ وہ ساکت رہ گیا۔ اسے پریشانی نے گھیر لیا اور دل بے قراری کے مارے مچلنے لگا۔ اس نے تکلیف کے باوجود خود کو کھڑا کیا۔ بستر کے کنارے اس کا کوٹ رکھا تھا اور خون آلود شرٹ بھی۔

اس نے کوٹ پہننے کا عمل شروع کیا۔ پیٹھ کے زخموں سے کوٹ کی رگڑ ہوئی تو اس نے تکلیف دہ سسک جاری کی۔ مگر اس نے ہر تکلیف کو نظرانداز کیا۔ وہ فوری طور پر یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ صرف یہاں سے ہی نہیں، وہ اب ہندوستان سے ہی چلا جانا چاہتا تھا۔

وہ گھر کی داخلی راہداری پر لنگڑا کر پہنچا۔ جسم جواب دے چکا تھا لیکن اس نے ضبط بحال رکھا۔ وہ جلد از جلد بگھی پر سوار ہو کر سرائے پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس شہر میں، اس گھر میں اسے اپنا آپ کسی مجرم سا لگ رہا تھا۔

اسی وقت پیچھے سے ایک سرد اور رعب دار آواز گونجی۔ وہ جہاں تھا وہیں تھم گیا۔

"آپ جا رہے ہیں؟" یاسمین کو اس کی پشت نظر آرہی تھی۔ اس کے گندمی چہرے پر تکان تھی۔

البرٹ یکدم سکتے میں آگیا۔ آج اس کی آواز میں کچھ ایسا تھا جس نے اسے حیران کر دیا۔ مدھم سی نرمی گھلی ہوئی

تھی اس کی آواز میں۔ اس نے الجھ کر بھنویں سکیڑیں۔ وہ اس بدلاؤ کو بوجھنے سے قاصر تھا۔

"جی۔" آواز بلا تاثر تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ شاید وہ اسے دیکھنے کی ہمت کھو بیٹھا تھا۔

یاسمین کی نگاہیں ترحم ہوئیں۔ اس نے حلق سے ڈھیر سارا تھوک نگلا۔

"کیا آپ ہمیں معاف کر سکتے ہیں؟"

وہ جملہ سن کر البرٹ پورا کا پورا مڑ گیا اور یاسمین کو گھورنے لگا۔ اسے یقین نہ آیا کہ وہ یاسمین ہی تھی۔ حیرت کے جھٹکوں کا مقابلہ کرتے اس نے لب کھولے۔

"معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔ کل رات میں نے جو بھی کہا، مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا۔" وہ بمشکل اپنی حیرت چھپا پایا۔ یاسمین کے متغیر ہوتے انداز نے اسے دنگ چھوڑ دیا تھا۔

"نہیں البرٹ۔ خطاء ہماری ہے۔ ہمیں کسی نے حق نہیں دیا کہ آپ کی اس قدر تذلیل کریں جب کہ آپ نے آج تک کچھ قابلِ اعتراض نہیں کیا۔ ہم اپنے اعمال کی کوئی وضاحت نہیں دیں گے کیونکہ جو غلط ہے وہ غلط ہے۔" گردن اکڑی ہوئی تھی، مگر چہرے سے وہ نادم تھی۔

البرٹ نے پلکیں جھپکا کر استعجاب سے کچھ دیر یاسمین کو دیکھا۔ آج پہلی مرتبہ اسے یاسمین کے گندمی چہرے کو اتنی فرصت سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس چہرے میں سب سے نمایاں شے وہ بادامی شکل کی سیاہ آنکھیں تھیں۔ اس کے چہرے پر الگ طرح کی پختگی تھی۔

"تو بتائیں؟ کیا آپ ہمیں معاف کریں گے؟"

وہ آنکھیں جو ندامت و شرمندگی اپنے اندر سمائے ہوئے تھیں، البرٹ کے دل کو کسی موم بتی کی طرح پگھلانے لگیں۔ کچھ دیر وہ سب کچھ بھلا بیٹھا۔ اپنا ہر زخم۔ کوٹ سے رگڑ کھاتے ان زخموں کی تکلیف۔ وہ کہاں تھا۔ کیسے آیا تھا۔ کچھ لمحے ہر شے نے اپنا معنی کھو دیا۔

وہ ٹھیک ہی سمجھا تھا۔ وہ سیاہ آنکھیں بہت گہری تھیں۔ بہت گہری۔ اس کی سوچ سے بھی زیادہ گہری۔ وہ گہرے راز اپنی گہرائیوں میں چھپائے ہوئے تھیں۔ وہ پرکشش تھیں۔ وہ پراسرار بھی تھیں۔

وہ کچھ دیر مبہوت سا ہو کر اس سیاہ آنکھوں کو گھورتا رہ گیا۔ شہد رنگ آنکھوں میں کچھ نیا سا تھا، کچھ جو پہلے کبھی نہ دیکھا گیا۔

"بتائیں؟ کیا ہمیں معاف نہیں کریں گے؟" وہ پھر سے بولی۔

اس کی آواز نے اس کے حس بیدار کیے۔ پلکیں جھپکتے اس نے سر کو ذرا سا جھٹک دیا۔ دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ دل میں چنگاری سی لگی تھی، کچھ لمحے کے لیے وہ دہکا تھا۔ اس نے سیاہ آنکھوں سے نظریں چرا لیں۔ اب مزید انھیں دیکھ لیتا تو شاید خود کو کھو بیٹھتا۔

"اچھا۔ ایک شرط پر۔" وہ مسکرایا تو یاسمین کے دل سے وزن سرکنے لگا۔

"جی جی۔ بتائیں۔"

"آپ مجھے رام باغ گارڈن لے کر جائیں گی۔ اور براہ مہربانی انکار سے گریز کریں۔ مجھے اکیلے گھومتے ہوئے کوفت محسوس ہوتی ہے اور مجھے وہاں جانا بھی ہے۔" اس نے نظریں جھکائے ہی کہا۔

اس کی شہد رنگ آنکھوں میں منت دیکھ کر یاسمین انکار نہ کر سکی۔ اس نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔

"اچھا۔ چلیں، کب جائیں گے۔" وہ اندر سے مطمئن ہونے لگی تھی۔ اسے اذیت دینے کے اس بوجھ سے رہائی حاصل کرنے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔

"بس جیسے ہی زخم تھوڑے بہتر ہو جائیں گے میں بگھی لے کر چمنِ گلاب پہنچ جاؤں گا۔" وہ تکلیف کے باوجود آخر میں مختصر مسکرایا۔

یاسمین کو احساس ہوا کہ وہ تکلیف چھپانے میں کافی مہارت رکھتا تھا۔

"بہت خوب۔ اور ہاں، کچھ دن آرام فرمائیں، کام کاج کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" ایک دفعہ پھر سے یاسمین کے چہرے پر سرد مہری اور سفاکی لوٹ آئی تھی۔ آنکھوں کی ٹھنڈک اور دبا دبا رعب واپس اپنی جگہ پر آ چکا تھا۔

البرٹ نے یہ تبدیلی دیکھی تھی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

"اب یہ ظلم نہ کریں۔" آواز میں مصنوعی خفگی تھی۔ "میں چلوں گا پھروں گا نہیں تو چمنِ گلاب کیسے آؤں گا؟ باخدا میں کل وہاں سے کچھ نہ لینے پر ویسے ہی خود کو ملامت کر رہا ہوں۔"

یاسمین کی آنکھوں میں پر سوچ تاثر ابھرا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ ہم سرائے میں روز کچھ نہ کچھ بجھوا دیں گے۔ اپنی صحتیابی تک آرام فرمائیں۔"

اس کی پیش کش پر البرٹ خوشی سے چہک اٹھا۔

"اجازت چاہوں گا۔" سر کو خم کر وہ مڑ گیا۔

یاسمین اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ دروازے پر پہنچ کر وہ رکا۔ مڑ کر ایک نظر یاسمین کو دیکھا۔

"آپ سے ایک بات کہہ سکتا ہوں؟"

برفیلے چہرے والی گندمی لڑکی کو دیکھتے، وہ شریر لہجے میں بولا۔ شاید اسے ایک بار پھر دیکھنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔

یاسمین نے سرد مہری سے گردن ہلا کر اسے اجازت دی۔ پلک جھپکاتے وہ اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

"آپ کے کرخت انداز ہی آپ پر جچتے ہیں۔" بس اتنا سا کہہ کر وہ دہلیز پار کر گیا۔

یاسمین کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔

یک دم وہ ہنس پڑی۔ اس بار ہنسی و مسکراہٹ پھیکی اور بے مقصد نہ تھی، بلکہ اس میں خوشی کی رمق تھی۔ بہت عرصے بعد وہ اس طرح ہنس رہی تھی اور یوں ہنس دینے کے بعد دل کس طرح کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے، وہ تو جیسے بھول ہی چکی تھی۔

......☆☆☆......

اس دن شہر امرتسر کے آسمان پر بادلوں نے چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ البتہ، بادل برسے نہیں۔ بس ٹھہر کر امرتسر کے باشندوں کی زندگیوں کے حصہ بنے ہوئے تھے۔

چمنِ گلاب کے باورچی خانے میں یاسمین بلند آواز میں ملازماؤں کو ہدایات دے رہی تھی۔ ٹھیک اسی وقت باورچی خانے میں روشی داخل ہوئی۔

انگیزشِ عدل

"یاسمین صاحبہ۔"

اس کی پکار پر یاسمین مڑی۔ ماتھے پر مصروفیت کے بل نمودار ہوئے۔

"کہو۔" اپنے ازلی انداز میں گویا ہوئی۔

"باہر، بگھی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ البرٹ صاحب آپ کی راہ تک رہے ہیں۔"

یاسمین کے ماتھے کی شکنیں فنا ہوئیں۔ آنکھوں میں مسرت ابھری۔ اس نے آٹے میں سے ہاتھ آزاد کیے۔

"ٹھیک ہے۔ ہم آرہے ہیں۔ ہماری واپسی تک، بیکری سنبھالیے گا۔" اس نے نرم انداز میں اسے ہدایت دی۔ روشی نے ادب کے ساتھ سر کو خم دیا۔

جانے سے قبل، یاسمین کی نظر روشی کی بالیوں پر پڑی جو اسے سونے کی لگی تھیں۔ ان میں چند ہیرے بھی جڑے ہوئے تھے۔ اس نے بھنویں سکیڑیں۔ دماغ میں ان کے متعلق سوالات ابھرے تھے، مگر سب نظر انداز کر کے وہ باہر چلی گئی۔

البرٹ بگھی کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ آج کے دن کی مناسبت سے وہ کافی تیار تھا۔ سفید شرٹ پر اس نے نیلا اوورل آل پہنا ہوا تھا اور نیلا کوٹ بھی۔ سر پر نیلی ٹوپی جمائی ہوئی تھی۔ بہر حال مونچھیں وہ کاٹ چکا تھا۔

کچھ لمحے بیت گئے تو یاسمین بگھی میں سوار ہوئی۔ اسے دیکھ کر البرٹ کی آنکھیں کھل اٹھیں۔ وہ خود بھی نہ جانتا تھا کہ اس کی آنکھیں اسے دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں۔ یاسمین نے سرمئی کرتا شلوار زیب تن کیا ہوا تھا اور سر پر ہم رنگ دوپٹہ جمایا ہوا تھا۔

"مجھے لگا کہ آپ ارادے بدل چکی ہیں۔"

وہ اسے دیکھ رہا تھا اور وہ سیدھ میں، اس کی شہد رنگ آنکھوں میں امڈتی جذباتیت سے بے خبر، اس البیلی سی چمک سے بے خبر۔

یاسمین کے چہرے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ایک دفعہ پھر سے اپنے اوپر سرد مہری کا خول چڑھا چکی تھی۔

"ہم اپنے وعدوں سے پھرا نہیں کرتے، البرٹ۔" وہ اس کی جانب گردن موڑتے شان و شوکت سے بولی۔

البرٹ نے نظریں چرا لیں۔ اسے روبرو دیکھنا بڑا جگرے والا کام تھا۔

البرٹ مسکرا دیا۔ اسے یاسمین کے اس پر تحکم، رعب دار انداز کی عادت ہو چکی تھی۔ اور اسے وہ ان ہی انداز کے ساتھ اچھی لگتی تھی۔

بگھی بان نے لگام کھینچی تو گھوڑا ہنہنایا اور بگھی دوڑنے لگی۔ البرٹ اور یاسمین، دونوں کے موڈ ہی موسم کی طرح کافی خوشگوار تھے۔

لیکن کوئی تھا جو اس بگھی کو دیکھ کر سراسر ناخوش تھا۔ اس نے وہی یونی فارم پہن رکھا تھا، جو وہاں کے پولیس افسر پہنا کرتے تھے۔ چھاتی پر اس کے نام کا ٹیگ تھا جس پر انگریزی حرف میں "جیمس اینڈرسن" لکھا ہوا تھا۔ یک دم اس کی آنکھیں سوچ میں چھوٹی ہوئیں، جیسے کسی خیال نے اس کے دماغ میں جنم لیا ہو۔

اور تم بھی اندازہ لگا سکتے ہو یہ خیال شیطانی تھا۔ دماغ منصوبوں کو ترتیب دینے میں مگن تھا۔

وہ کیسے اپنے ہی ملک کے باشندے کو ایک ہندوستانی عورت کے ہتھے چڑھتے دیکھ سکتا تھا؟ وہ بھی ایک مسلمان۔ کبھی نہیں۔ اسے یہ قربت بری طرح کھل رہی تھی۔

سر جھٹک کر اس نے اپنا دورا جاری رکھا۔ البتہ، یاسمین کی زندگی دشوار بنانے کا ارادہ، پختگی اختیار کر چکا تھا۔

......☆☆☆......

بھوری بگھی امرتسر کی ایک گلی سے دوسری، اور دوسری سے تیسری کا سفر طے کرتی۔ دیکھا جائے تو امرتسر ایک خوبصورت شہر ہے۔ یہاں کی عمارتیں تو کسی شاہکار سے کم نہیں۔ ان پر تعمیراتی کام انتہا کا تفصیلی اور دلکش ہے۔ ہر کالونی میں مختلف لباس میں لوگ نظر آئیں گے۔ کہیں پر عورتیں ساڑھیوں میں ملبوس، تو کہیں پر عبائے میں۔ یہی ماجرہ مردوں کا بھی تھا۔ کہیں وہ اچکن میں ملبوس ہوں گے تو کہیں کوٹ پینٹ یا دھوتی میں بھی۔

"کیا آپ مہاراجہ رنجیت سنگھ میوزم جائیں گے؟" یاسمین نے سیدھ میں دیکھتے سوال پوچھا۔

"نہیں نہیں۔ مجھے تاریخ میں کوئی دلچسپی نہیں۔"

اس بات پر یاسمین نے الجھ کر بھنویں سکیڑیں، البتہ آنکھوں کی سرد مہری برقرار رہی۔

انگیزشِ عدل

"ہم تو یہی سمجھے تھے کہ آپ مہاراجہ رنجیت سنگھ میوزیم کا دورا کریں گے۔ کیونکہ وہ سیاحواں میں کافی شہرت کا حامل ہے۔ پھر کس چیز میں دلچسپی ہے آپ کو؟" لاتعلق انداز۔

البرٹ کی آنکھوں میں روشنیاں انعکاس ہونے لگیں۔

"کھانے میں!" وہ کھل کھلا کر بولا

بس کھانا؟ اس نے حیرت سے اس مرد کو دیکھا۔

"وہاں امرتسری کلچا ملتا ہے۔ مجھے وہ کھانا ہے اور اپنی کتاب میں اس کو کھانے کا تجربہ تحریر کرنا ہے۔"

یاسمین کو اس کی ترغیب کچھ معیوب معلوم ہوئی۔ آنکھیں چھوٹی کیں۔ یہ کیسی نرالی سی کتاب تھی؟ اسے تجسس سا ہوا۔

"یعنی آپ پکوانوں پر کتاب لکھ رہے ہیں؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ نے چمنِ گلاب کی بھی تمام اشیاء کو اپنی کتاب میں شمار کیا ہو گا؟" اس کی آواز میں استفہام تھا۔

"جی جی۔ مگر آپ کو کوئی اعتراض......" وہ مڑ کر یاسمین کو دیکھنے لگا۔ ایک دم سے سارے الفاظ ذہن سے چھٹنے لگے۔ دل بہت ہی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ یہ کیا ماجرہ تھا بھلا؟ اس کی سوچوں میں اچانک سے خلل کیوں پیدا ہو رہی تھی؟

کوئی اعتراض تو نہیں؟" وہ بمشکل بول کر نظریں پھیر گیا۔

"ہمیں کیوں اعتراض ہو گا؟" وہ ایک ادا سے بوی۔ "ہمیں چمنِ گلاب پر، اپنی ترکیبوں پر پورا بھروسہ ہے۔ آپ ان پر شوق سے لکھیں۔" نظریں پھر سے سیدھی کیں۔

"لیکن میری کتاب صرف کھانے پینے کے بارے میں نہیں، غالباً کھانا پینا اور ہندوستان کی وسیع ثقافت اس کا حصہ ضرور ہے لیکن یہ کتاب میرے تجربات پر مبنی ہے۔ اب اتفاق سے میرے تجربات میں کھانا پینا غالب ہے تو یہ کتاب ایک طرح سے ہندوستان کے وسیع کیوزین پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔"

اب یاسمین کو اس کی کتاب کی تھوڑی بہت سمجھ آگئی تو اس کی آنکھیں عامیانہ ہوئیں۔ اس نے گردن موڑی اور

چکور کھڑکی سے باہر کے مناظر تکنے لگی۔

"آپ کی اردو اتنی خالص کیسے ہے ؟لب ولہجہ اس قدر صاف ہے۔ کوئی خاص وجہ ؟" اس نے کھڑکی سے باہر، مصروف ترین بازار کے نظارے دیکھتے ہوئے سوال پوچھا۔

"کیا ہے کہ میرے گرینڈ پا اور میرے پاپا، دونوں ہی ہندوستان سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ یہاں کی ہر چیز سے۔ ہر روایت سے۔ اور یہاں کی زبانوں سے بھی۔ انھیں دیکھ کر مجھے بھی بڑا شوق ہوا۔"

یاسمین نے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ نظریں جھکائے، اپنے آپ میں مسکراتے اسے سب بتا رہا تھا۔ اس کی جھکی نظریں دیکھ کر اسے اچھا لگا تھا۔ ایک عجیب قسم کا تحفظ کا احساس تھا وہاں۔

"اس لیے میں نے اردو سیکھی۔ میں نے بچپن میں ضد کر کر کے اپنے لیے استاد لگوائے۔ اور اردو جیسی زبان سے کوئی محبت کیسے نہیں کر سکتا؟ یہ محبت کی بولی ہے، پیاری کی بولی ہے۔ میٹھی اور شائستہ زبان ہے۔" گردن اٹھی۔ کچھ ثانیے مڑ کر اس سیاہ آنکھوں والی لڑکی کو دیکھا۔

یاسمین کو بھی شہد رنگ آنکھوں سے دیدار کا شرف ملا۔ وہاں صرف سادگی تھی، معصومیت تھی۔ کچھ لمحے زندگی کی ہر پیش رفت تھم گئی۔ دونوں آنکھیں ایک رہیں۔ پھر ہمہ وقت دونوں نے ہی گردنیں جھٹک لیں۔

اسی اثناء میں گھورے ہنہنائے۔ بگھی زور کا جھٹکا کھاتے رک گئی۔

دونوں کا آگہی مل گئی تھی کہ ان کی منزل آن پہنچی تھی۔

......☆☆☆......

چودہ فٹ اونچا گیٹ ان دونوں کا استقبال کر رہا تھا۔ گیٹ کے دونوں اطراف قد آور مینار بھی تھے۔

رام باغ کے چاروں اطراف چودہ فٹ لمبی دیواریں قائم ہیں۔ باغ کو آسمان کی بلندیوں سے دیکھیں تو نہایت خوبصورت نظر آئے گا۔ پتھروں کے بنے متناسب راستے دکھائی دیں گے۔ باغ کے وسط میں ہی ایک محل بھی نظر آئے گا۔ اور اسی محل کے دائیں بائیں طرف راستے بنے ہوئے تھے جو کہ دو چھوٹے چھوٹے محلوں تک جاتے تھے۔

رام باغ گارڈن میں داخل ہوتے ہی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا دونوں سے ٹکرایا۔ وہ دونوں پتھریلی روش پر چل رہے

تھے۔ دائیں اور بائیں جانب اونچے تن آور، ہرے بھرے درخت تھے اور چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ چرند پرند کی چہچہاہٹ کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ فضا کی تروتازگی نے اس منظر کو مزید خوبصورتی بخشی۔

"مجھے ہندوستان اس لیے بہت پسند ہے۔ یہاں قدرت کے نظارے نہایت حسین ہیں۔ سب کچھ بہت خالص لگتا ہے، ہر طرح کی ملاوٹ سے پاک۔" البرٹ چہکا جب کہ یاسمین میکانکی سے انداز میں چلتی گئی۔

باغ میں رش کافی زور و شور سے تھا اور عموماً سکھ ہی نظر آرہے تھے۔ البتہ گارڈن کا رقبہ اس قدر وسیع تھا کہ اس رش کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

"آپ یہاں کتنی مرتبہ آچکی ہیں؟" اس نے گفتگو چھیڑنا چاہی۔

اس معمولی سے سوال نے یاسمین کو بہت دور، ماضی میں پہنچایا۔ سیاہ آنکھیں کسی یاد میں کھو گئیں۔

"ہاں۔ کسی زمانے میں ہم بھی یہاں آیا کرتے تھے۔ اپنے والد کے ساتھ۔" پھیکی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھری۔ گویا وہ یادیں اب میٹھی نہ رہی ہوں۔

"اب آپ کا خاندان کہاں ہے، یاسمین؟"

یاسمین کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔

"قبرستان۔" یک لفظی جواب نے البرٹ کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔

وہ تھم گیا، جب کہ یاسمین سست روی سے چلتی گئی۔ دل میں بسی خوشگواری کی جگہ افسردگی نے لے لی۔ وہ دلفریب منظر، ٹھنڈی ہوائیں اور چرند پرند کی چہچہاہٹ بھی اس افسردگی کو جگہ سے نہ ہلا سکیں۔

یاسمین نے مڑ کر البرٹ کو دیکھا۔

"رک کیوں گئے؟" وہ رکی۔

البرٹ نے مغموم آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"یہاں ہر کسی کی یہی کہانی ہے۔"

البرٹ نے ایک جھٹکا کھایا۔ چلتے ہوئے وہ اس کے ساتھ پہنچا۔ دونوں ایک مرتبہ پھر ہم قدم ہوئے اور چلتے

گئے۔

”ہر گلی میں۔ ہر گلی میں یتیم بستا ہے۔ ہر گلی میں کسی بہن کا بھائی، کسی کا شوہر، کسی کا بیٹا عبرتناک قید جھیل رہا ہے۔“

البرٹ کسی گہرے خیال میں کھو گیا۔ دل بالکل بھاری ہونے لگا تھا۔

”is it even worth it?“ وہ خواب سی کیفیت میں زیرلب بڑبڑایا۔

یاسمین اپنی جگہ رک گئی۔ البرٹ بھی رکا۔ دونوں نے رُخ ایک دوسرے کی طرف موڑا۔ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ زخمی سا مسکرائی۔ اس زخمی مسکراہٹ نے اس کی روح پر بھی ضربیں لگائیں۔

”نہیں جانتے۔ مگر اب موت ہے یا آزادی۔“ آواز دھیمی، مگر بھاری تھی۔ آنکھوں میں ایک الگ جذبہ تھا جس سے وہ آہستہ آہستہ روشناس ہو رہا تھا۔

”بات بات پر لاجواب ہو رہے ہیں۔ اگر سب جان گئے تو شاید گونگے ہو جائیں گے۔“ وہ ذرا سا تلخی سے کہتے رخ موڑ گئی۔

وہ اس کی جذبات سے دہکتی ہوئی سیاہ آنکھوں کو ذہن سے نکال نہیں پا رہا تھا۔

کچھ لمحات خاموشی کی نذر ہوئے۔ وہ دونوں ہم قدم چلتے گئے۔ بچوں کی کھل کھلاہٹ، والدین کی ڈانٹیں اس مختصر چہل قدمی میں سنائی دیں۔

”ہم جانتے ہیں کہ ہم ایک خشک ساتھی ہیں۔ یقیناً آپ بےزار ہو رہے ہوں گے۔ یہ تو آپ کی ضد کی بدولت ہمیں آنا پڑا، ورنہ ہم کبھی نہ آتے۔“ وہ ازلی سرد انداز میں بولی۔

البرٹ گردن نفی میں ہلانے لگا تھا۔ اس نے کچھ دیر پہلے کی سوگواریت کم کرنا چاہی۔

”میں یہاں اپنی وجہ سے نہیں آیا۔ بلکہ آپ کی وجہ سے آیا ہوں۔“ وہ مسکراہٹ لبریز آواز میں بولا تو یاسمین کے قدم سست ہوئے۔

”ہم سمجھے نہیں؟“ وہ الجھ گئی۔

انگیزشِ عدل

"ہاں تو اور کیا۔ میں نے تو آپ کو پہلے ہی بتایا تھا کہ مجھے صرف کلچے میں دلچسپی ہے۔ ادھر تو میں آپ ہی کے لیے آیا ہوں۔ آپ کو ضرورت ہے آرام کی۔ خود کے ساتھ وقت گزارنے کی۔ قدرت میں گھومیں۔ تھوڑا مسکرائیں۔ قدرت کے کرشموں سے محظوظ ہوں۔ معلوم نہیں، لیکن آپ کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے آپ زندگی جینا جانتی ہیں نہ چاہتی ہیں۔" البرٹ اپنی دھن میں بولتا گیا، جب کہ یاسمین کی آنکھیں مرجھا گئیں۔

"ہنسنا مسکرانا، زندگی جینا۔" اس نے تھکی ہوئی سانس خارج کی۔ "یہ سب کچی عمر میں ہی اچھا لگتا تھا۔ اب تو بس۔ بس زندگی ہے اور مصروفیات۔" اس کی آواز وزنی محسوس ہوئی۔

"تو آپ کی عمر کتنی ہے؟" وہ متجسس ہوا، اور بھنویں سکیڑ کر پوچھنے لگا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ عورتوں کی عمر پوچھنی نہیں چاہیے۔ مگر اب تو حماقت کر بیٹھا ہوں۔" وہ ذرا سے شریر انداز میں بولا۔

"نہیں، ہمیں برا نہیں لگا۔ اٹھائیس برس۔"

جواب سن کر البرٹ ہنس دیا۔

"بس اٹھائیس برس؟ اتنے سنجیدہ تو ہمارے بزرگ بھی نہیں ہوتے، جتنی آپ ہیں، یاسمین۔ ہاں، مانا کام کی مصروفیات ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ جینا ہی چھوڑ دیں؟" وہ اپنے معصومانہ انداز میں اس کی دل جوئی کرنے لگا۔

یاسمین نے ٹھہر کر، لحظہ بھر اس کی شہد رنگ آنکھوں میں جھانکا۔ وہ اس کے لیے بے چین لگتی تھیں۔ بے قرار لگتی تھیں۔ گویا صرف ایک شے ان کو قرار پہنچا سکتی ہوں، اور وہ تھی اس کی خوشی۔ ایسا کیوں تھا؟ وہ اپنے ذہن کو ٹٹولتے کوئی جواب تلاش کرنے لگی، مگر اسے کوئی اطمینان بخش جواب نہ مل سکا۔

"آپ کے لیے کہنا آسان ہو گا۔ آپ کے لیے خوش رہنا آسان ہو گا۔ ہمارے لیے نہیں ہو سکتا۔" وہ اس کے چہرے سے نظریں پھیرتے، مضطرب انداز میں بولی۔

اس بات پر البرٹ نے گردن نفی میں ہلائی۔

انگیزشِ عدل

”مجھے لگتا ہے کہ زندگی میں چاہے جتنے غم کیو نکر نہ ہوں، ہمیں خوش رہنا چاہیے۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی کہ پریشانیوں میں انسان جینا ہی چھوڑ دے؟ یا ذمہ داریوں کے بوجھ تلے زندگی سے بے بہرا ہو جائے۔“

”یہ باتیں کرنا آسان ہوتی ہیں، البرٹ۔ لیکن عمل کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔“

اس گفت وشنید کے سلسلے کے دوران وہ باغ کے وسط تک پہنچ چکے تھے۔ البرٹ کچھ بولنے ہی لگا تھا کہ اس کی نظر، سامنے کھڑے اس بلند و بالہ سفید محل پر پڑی۔ وہ آنکھوں میں اشتیاق لیے اسے دیکھنے لگا۔

”اسے سمر پیلیس بھی کہتے ہیں۔“ یاسمین اس کی آنکھوں میں دلچسپی کو بھانپ کر وضاحتیں دینے لگی۔ وہ آنکھیں بڑی آئینہ دار تھیں۔ انھیں دیکھتے ہی کوئی بھی سمجھ جائے کہ وہ مرد کیا سوچ رہا ہے، کیسا محسوس کر رہا ہے۔

”مہاراجہ رنجیت سنگھ نے امر تسر فتح کرنے کے بعد باغ میں تعمیر کروایا تھا۔“

البرٹ نے سر اوپر نیچے ہلایا۔

”آپ کو تاریخ میں دلچسپی ہے؟“

”نہیں۔ لیکن اپنے شہر کی تاریخ جانتی ہوں۔ سب ہی جانتے ہیں۔“ اس نے البرٹ کی ان چمکتی آنکھوں میں اپنی بے جان آنکھیں ڈالیں۔

جہاں شہد رنگ آنکھوں میں زندگی جینے کا ذوق تھا، لگن تھی تو وہاں سیاہ آنکھیں، زندگی کی رونقوں سے محروم تھیں، جو ایک عالی شان محل کے دیدار پر بھی نہ بدلیں۔ کیا تھا جو ان آنکھوں کی ویرانی کا سبب بنا ہوا تھا؟ اور کیا تھا جو وہ شہد رنگ آنکھوں والا مرد ان آنکھوں کی رونق لوٹانے کے لیے کر سکتا تھا؟ وہ انھیں رنگوں سے بھرپور دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ انھیں کھلتے ہوئے سورج مکھی کے پول کی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔

”اندر جائیں گی میرے ساتھ؟“ البرٹ نے ادب سے درخواست کی۔

”آپ ہو آئیں۔ اندر بت ہیں اور ہم جا نہیں سکتے ہیں۔ ہم باہر ہی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

البرٹ نے مایوس کن سانس خارج کرتے سر اوپر نیچے ہلایا اور اندر چلا گیا۔ تاریخ کے ان شاہکاروں میں، اسے خاص دلچسپی تو نہ تھی، مگر سمر پیلس کی خوبصورت عمارت نے اسے اندر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

انگیزشِ عدل

فرش پر سفید ٹائلز بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر سرخ پینٹ تھا۔ دیواروں پر مصوراتی شاہکار بھی لٹکے ہوئے تھے۔ شیشوں کے بکسوں میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا سامان قید تھا۔ جیسے کہ تلواریں، ان کا کوچ اور ان کی پگڑی بھی۔ البرٹ ہر ایک چیز کا جائزہ لینے لگا۔ ان سب اشیاء کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ ہم سے پہلے بھی ایک وقت گزرا ہے، جو ہمارے وقت سے بہت مختلف تھا۔ جہاں لوگ بہت مختلف تھے۔ ان کی جدوجہد مختلف تھی، ان کی ترجیحات بھی ہم سے کافی مختلف تھیں۔

مگر ان سب کو دیکھتے ہوئے بھی یاسمین کا خیال اس کے ذہن سے نہ کھسکا تھا۔ اس کی باتیں اب بھی اس کے ذہن میں بازگشت کر رہی تھیں۔

وہ باہر آیا تو چہرے پر ایک تازہ دم مسکراہٹ تھی۔ شہد رنگ آنکھوں میں روشنیاں بھری ہوئی تھیں۔

وہ گردن دائیں بائیں گھماتے، متلاشی نظروں سے یاسمین کو ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر، باغ کے ایک سرسبز حصے پر گئی جہاں یاسمین دو بچوں کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے بٹوے سے چند سکے نکال کر ان کے ہاتھوں میں تھما رہی تھی۔

البرٹ مبہوت نگاہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ دل شادماں تھا اور لبوں پر آسودہ مسکراہٹ رقم تھی۔ فیاض اور سخی ہونا کیسا ہوتا ہے، اس نے یاسمین سے سیکھا تھا۔ وہ کچھ لمحے ٹھہر گیا۔ وہ ایک عجوبہ تھی۔ عجوبہ۔ کچھ دن پہلے وہ اسے شدید ناگوار معلوم ہوئی تھی، مگر اب اس سے زیادہ عظیم کوئی لگتا ہی نہ تھا۔

وہ اسے دیکھتے ہوئے، دھیمے سست قدم بڑھانے لگا۔ کچھ دیر میں یاسمین کی پشت پر کھڑا ہوا۔ تبسم لبوں سے جدا ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ یاسمین کو اس کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔

وہ کھڑی ہوئی۔ بچے اس سے تشکر کا اظہار کرتے، وہاں سے چلے گئے۔

”لیڈی یاسمین۔ مجھے لگتا ہے، جیسے آپ اپنی محرومیوں کے باعث ہر کسی پر اس قدر مہربان ہیں۔ بالکل ایمیلی کی طرح۔“ وہ ایسے بولا جیسے اس پر کوئی نیا انکشاف ہوا ہو۔

یاسمین الجھ گئی۔

"ایمیلی کون؟"

"میرے ناول کا ایک کردار ہے۔ اس کی بھی یہی خصلت تھی۔ چونکہ اس نے زندگی میں سب کچھ گنوا دیا تھا، بس اس لیے دوسروں کے لیے وہ روشنی کی کرن بن جاتی تھی اور یوں سمجھ لیں اپنے دل کے خانوں کو، جو کہ محبت سے خالی ہیں، دوسروں سے محبت کر کے، بھر دیا کرتی تھی۔"

اس کی تھیوری سن کر یاسمین کے لب پھیلے اور مسکراہٹ جلد کھل کھلاہٹ میں تبدیل ہوئی۔ البرٹ کے لب پھیلے۔ آنکھوں میں نرمی اتر آئی۔ مگر جوں ہی افسردگی اس کی آنکھوں میں دوڑی۔ یہ کھل کھلاہٹ اتنی خالی، اتنی نامکمل کیوں تھی؟ وہ اسے دل سے ہنسانے کے لیے، دل سے خوش کرنے کے لیے آخر کیا کر سکتا تھا؟ کیوں وہ اس کی نامکمل خوشیوں پر تڑپ رہا تھا؟ وہ جو دوسروں کو سمجھنے میں ماہر تھا، آج خود کو سمجھ کیوں نہ پا رہا تھا؟

"آپ کچھ زیادہ سوچتے ہیں، البرٹ۔ ضروری تھوڑی ہے کہ انسان کے ہر عمل کے پیچھے کوئی وضاحت چھپی ہو۔" وہ مسکراہٹ دباتے بولی۔

البرٹ نے آنکھوں کے تاثرات بحال کیے۔ دل کے ابال کو بڑی مشکلوں سے دبایا۔ البرٹ ونسٹن میں کچھ بدل رہا تھا۔ یہ بدلاؤ اس کی سوچ و فہم سے بھی بالاتر ثابت ہو رہا تھا۔

"معلوم نہیں کہ میرے اندازے درست ہیں کہ نہیں۔ غالباً آپ میری بات سن کر ہنس دیں میرے لیے یہی کافی ہے۔ سچ بولوں تو آپ کو بھی خوش و خرم رہنا چاہیے۔ جب آپ ان بچوں کو سکے دے رہی تھیں تو ان کے چہروں پر نظر ڈالی تھی؟ کتنے خوفزدہ تھے۔ اگر یہی عمل آپ مسکرا کر کرتیں تو ان کی خوشیاں دوبالا ہو جاتیں، یاسمین صاحبہ۔ زندگی کی تلخیوں کو اپنی شخصیت کا حصہ نہیں بنانا چاہیے۔ میرا تو یہی ماننا ہے۔" اتنا چلنے کے بعد پاؤں درد کرنے لگے تھے، اس لیے وہ بینچ پر بیٹھ گیا۔

"ہم وہی کہیں گے جو کچھ دیر پہلے کہہ چکے۔ باتیں کرنا آسان ہوتی ہیں، ان پر عمل نہایت مشکل ہے۔ لیکن ہم کوشش ضرور کریں گے۔"

آخر میں البرٹ مسکرا دیا۔

"چلیں پھر۔ کلچے کھانے چلیں؟" ٹانگوں کو راحت آئی تو وہ کھڑا ہوا۔

یاسمین نے سرد مہری سے سر اوپر نیچے ہلایا۔

وہ لوگ رام باغ سے باہر آئے۔ تھوڑی سی چہل قدمی کے بعد ایک ٹھیلا نمودار ہوا، جہاں تازہ تازہ گرما گرم امرتسری کلچے بنائے جارہے تھے۔

"اوہ نو!" البرٹ کے چہرے پر مایوسی ابھری۔ کلچے والا تندور پر کلچے لگا رہا تھا۔

"سب خیریت ہے؟" یاسمین نے پوچھا۔

"مجھے اسے بنتے ہوئے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔" اس نے خفگی سے سر جھٹکا۔ "اب کسی اور دن آنا پڑے گا۔"

اب وہ آدمی ایک لمبی سی راڈ سے کلچے پلٹ رہا تھا۔

یاسمین نے مڑ کر اس کے پریشان چہرے کو دیکھا تھا۔

"ہم بتادیں گے۔ امرتسری کلچے تو امرتسر کی شان ہیں۔ انھیں بنانا تو عورت عورت کو آتا ہے۔" وہ شان سے بولی تھی۔

"بس پھر ٹھیک ہے۔" البرٹ کا موڈ بحال ہوا۔ چہرے کی رونق لوٹ آئے۔

کیا اتنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھی اس مرد کی؟ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر مبہم سا مسکرا دی۔

ٹھیلے والے نے الومینیم کی پلیٹ میں کلچے کا چکور پیس ڈالا اور پھر ساتھ پیالوں میں چھولے بھرے اور املی پیاز کی چٹنی بھی۔ ان کلچوں سے بڑی زبردست قسم کی خوشبو آرہی تھی جس سے البرٹ کے منہ میں پانی بھر گیا تھا۔ کلچوں کو لے کر وہ یاسمین کے سنگ ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔

البرٹ نے پہلے تو کلچے کے ہر ایک زاویے کا بغور جائزہ لیا۔ وہ بھورا تھا، کناروں سے گہرا بھورا اور کہیں کہیں سنہرا اور زرد بھی۔ اس کے اوپر دیسی گھی کا چھڑکاؤ ہوا تھا۔ کلونجی اور تل بھی چھڑکے گئے تھے۔ اضافی نکھار کے لیے اس پر ہرا دھنیا بھی ڈالا تھا۔

انگیزشِ عدل

البرٹ نے پورا کلچا ہاتھ میں اٹھایا، اور اس کا ایک لقمہ بھرا۔ کلچہ نہایت کرارا تھا۔ منہ میں جاتے ہی کڑک آواز کے ساتھ چکنا چور ہو گیا۔ لذیذ ذائقہ اس کی زبان سے ٹکرایا۔ وہ چٹپٹا تھا اور اس میں بیشتر مصالحوں کی آمیزش تھی۔ اس میں آلو کا خاص ذائقہ تھا اس کے ساتھ وہ مٹر، پیاز، کو بھی محسوس کر سکتا تھا۔ اسے اب سمجھ آیا تھا کہ یہ کلچے آخر اتنی شہرت کے حامل کیوں تھے۔

وہ دنیا سے ہوش کھو بیٹھا تھا اور پورا کلچا جھٹکے میں کھا گیا۔ جب کلچا ختم ہو گیا تو جیسے وہ بیدار ہوا۔ گردن موڑ کے یاسمین کو دیکھنے لگا جس نے آدھا کلچا کھالیا تھا اور باقی بچالیا۔ یاسمین اٹھ کر سڑک پار ایک عورت کی طرف گئی جو کہ زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بچایا ہوا کلچہ اس عورت کے سپرد کر دیا۔

البرٹ یہ پر خلوص عمل دیکھ کر مسکرائے بغیر رہ نہ پایا۔ وہ پھر سے اس کے برابر میں بیٹھی۔

”اب آپ مجھے بتائیں۔ یہ شاہکار بنتا کیسے ہے؟“ اس نے ہاتھ جھاڑے۔

”پہلے ہم آٹا گوندھتے ہیں اور پھر اس آٹے کی دیسی گھی کے ساتھ پرت بناتے ہیں۔ کوئی بیس بائیس پرتوں کے بعد ہم آٹے کو ہاتھوں سے پھیلا لیتے ہیں اور اس میں اپنے مصالحے ڈالتے ہیں۔ اور پھر آلو کا مادہ ڈال کر اوپر ایک آخری تہہ لگا کر تندور میں سیک لیتے ہیں۔ اور یہ لیں۔ امرتسری کلچے تیار!“ آخر میں اس نے شانے اچکا دیں۔

”واہ۔ واہ۔ اس لیے اس قدر خستہ تھے۔ ہم برطانیہ کے شہری تو نہ جانے کن کن عجوبوں سے محروم ہیں۔ مجھے تو ہندوستان کے اس پر ذوق کھانے کی اتنی بری لت لگ گئی ہے کہ اب ان کے بغیر زندگی تصور نہیں کر سکتا۔“

”تو نہ جائیں۔“ یاسمین نے سرسری سے انداز میں ہی کہا تھا۔

مگر کیوں وہ بس ان تین لفظوں پر جامد ہو گیا تھا؟ کیوں دل میں ایک کسک سی پیدا ہوئی تھی۔ اس نے مڑ کر اس لڑکی کو دیکھا۔ کیوں اسے دیکھ کر دل چاہا کہ وہ واقعتاً یہ مشورہ قبول کر لے؟ وہ عظمت کی دیوی تھی، وہ اسے اتنی عظیم لگتی تھی کہ وہ اسے زیادہ دیر دیکھ بھی نہ پاتا تھا۔ جلد نظریں پھیر گیا۔ مگر دل، وہ اب تک بے اختیار ہو رہا تھا۔

کوئی نہ جانتا تھا کہ البرٹ ونسٹن، ایک لکھاری ایک مسافر اس وقت کس کیفیت سے دوچار تھا۔

”ٹھہرنے کے لیے کوئی وجہ بھی تو چاہیے ہو گی۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ سیدھ میں اس عورت کو دیکھ رہا تھا جو

یاسمین کا بچا ہوا کلچا کھا رہی تھی۔

"پھر، واپسی کا ارادہ کب تک کا ہے؟"

ایک بار پھر سے سرسری انداز میں کہا۔ ایک بار پھر سے کسی کے دل پر چوٹ لگی۔ واپسی کا خیال افسردگی کا سبب ہمیشہ بنتا تھا، مگر آج یہ خیال تکلیف کیوں دے رہا تھا؟ یہ دل کیوں رنگوں سے بھری اس سرزمین سے دور جانے کے خیال پر کٹ رہا تھا؟

"کچھ ہفتوں تک۔" وہ پھر سے مرجھائی کلی کی طرح بولا۔

اب کہ یاسمین نے اسے مڑ کر دیکھا۔

"کچھ ہوا ہے، البرٹ؟" اس کی شہد رنگ آنکھوں کی بے رونقی دیکھ کر وہ بول اٹھی۔

البرٹ اداس سا مسکرا کر گردن دائیں بائیں ہلانے لگا۔

"نہیں تو۔" گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ہم آپ کو زیادہ جانتے تو نہیں۔ مگر آپ کی آنکھیں بہت خالص اور آئینہ دار ہیں۔ آپ کے باطن کی حالت ترنت آشکار کر دیتی ہیں۔ ہمیں آپ ٹھیک نہیں لگتے، البرٹ۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

وہ پل بھر کو لاجواب ہوا۔ یاسمین کے سامنے لاجواب ہو جانا معمول کی بات بن رہی تھی۔ اس کی باتیں اس کی ہر ادا، اس کا ہر انداز، ایک جھٹکے میں اس کی قوتِ گوائی سلب کر لیتا تھا۔ یوں کہ معمولی سے معمولی جملہ کہنا بھی دشوار بن جاتا تھا۔

اس نے بمشکل چہرے کی اداسی زائل کی۔ اب کی بار کھل کر مسکرایا۔

"واپسی کے خیال نے غمگین کر دیا تھا، لیڈی یاسمین۔ مگر کوئی بات نہیں۔ جتنے دن باقی ہیں، میں نے کھا پی کر، سیر سپاٹے کر کے گزارنے ہیں۔"

وہ کھل کھلا کر سب بتا رہا تھا اور یاسمین بس اسے دیکھتی گئی۔ وہ مسکراہٹ کسی وبا کی طرح تھی۔ اس سے توانائی پھوٹتی تھی۔ البرٹ کے چہکنے سے اس کے دل میں مسرت بھرا احساس بھر جاتا تھا۔ اس کا بھی اسی کے ساتھ مسکرانے

کا دل کرتا تھا، اسی کے ساتھ کھل کھلانے کا دل کرتا تھا۔

لیکن شاید۔ شاید اس بدلاؤ کی اسے عادت نہیں ہو رہی تھی۔ جب جب اس کا دل کھل کھلانے کو چاہتا اسے اپنا ماضی یاد آتا تھا، اپنا اصل یاد آتا تھا۔ اور وہ اس کے دل میں سر گوشی کرتا تھا کہ: تمھارا ہنسنے کا کوئی حق نہیں۔ اور یکدم اس کے اندر سے ہنسنے مسکرانے کی چاہ وفات پا جاتی۔ وہ اس وقت خود سے جنگ لڑ رہی تھی۔

شام ڈھلنے کو تھی، اس لیے البرٹ اور یاسمین نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک بگھی پر سوار ہو گئے اور رام باغ گارڈن کو الوداع کہہ کر چلے گئے۔

......☆☆☆......

زرد روشنیوں میں نہائی گلی میں بگھی آ کر رکی۔ گھوڑے ہنہنائے۔ وہ یاسمین کے گھر کے قریب پہنچ چکے تھے، مگر وہ اتری نہیں۔ آنکھوں میں سوچ سمائے، سیدھ میں دیکھتی گئی۔

"بگھی بان! کیا آپ پانچ منٹ کے لیے رک سکتے ہیں؟" وہ اپنے ازلی انداز میں بولی۔

"جی بالکل۔"

البرٹ کچھ الجھ گیا۔ مڑ کر یاسمین کو دیکھنے لگا۔

"ہم تمھیں کچھ دکھانا چاہیں گے، البرٹ۔ تم ہمیں کچھ مختلف معلوم ہوئے۔ کیا تم پانچ منٹ کے لیے ہمارے ساتھ آ سکتے ہو؟" اس نے سرد سے انداز میں پیشکش دی۔

البرٹ ونسٹن بھلے سے تھکا ہوا تھا۔ توانائی بھلے سے اپنے آخری دم پر تھی۔ مگر یاسمین کی استدعا سے انکار کرنا اس کے بس میں نہیں۔

"ضرور۔" ادب سے کہہ کر وہ بگھی سے اتر گیا۔

وہ دونوں گلیوں میں چلنے لگے۔ آس پاس کافی شور شرابہ تھا۔ مغرب ہونے والی تھی اس لیے بچے پسینوں میں نہائے ہوئے، کھیلتے کودتے اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔

"اس رات ہم نے تم پر بڑے سخت انکشاف کیے۔ ہمارا انداز غلط تھا۔ مگر ہم تمھیں اپنا زاویہ دکھانا چاہتے ہیں۔

تمھیں ایک دفعہ اصل ہندوستان دکھانا چاہتا ہیں۔ تمھیں ہندوستانیوں سے ملوانا چاہتے ہیں۔"

البرٹ یکدم چوکنّا ہوا۔ اس کی آواز میں سنجیدگی تھی۔ یاسمین نے چہرے کا رُخ ایک گھر کے دروازے کی اور کیا۔ جہاں ایک آدمی کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ البرٹ نے بھی اسی طرف دیکھا۔

"وہ نور الدین ہیں۔ سالوں پہلے تک امر تسر کے رئیسوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مگر پھر، ان کے صاحبزادے نے ایک دن باغیوں کو پانی پلایا۔ انسان سمجھ کر۔ اپنا بھائی سمجھ کر۔ اپنا سمجھ کر۔" آواز میں ہمدردی تھی۔

البرٹ نے ایک نظر اس گھر کو دیکھا۔ وہ عمارت نہایت بوسیدہ تھی۔ وہ کسی رئیس کی تو ہر گز نہ لگتی تھی۔

"اور ایک انگریز افسر کو ان کا یہ عمل برا لگا۔ اس نے نہ صرف ان پر جھوٹے الزامات لگائے بلکہ نواب کی ساری جائیداد ضبط کرلی۔" یاسمین نے چہرا سیدھا کیا۔

یکبارگی یہ شوروغل، بچوں کی خوشیاں البرٹ کے دل کو اداس کرنے لگیں۔ ان معصوم قہقہوں کے پسِ پشت اسے ایک تاریک، بھیانک ماضی نظر آرہا تھا۔ ان سب کی چہکتی ہوئی شریر آنکھوں کے سائے میں کسی انہونی کی موجودگی محسوس ہو رہی تھی۔

"آج وہ ایک چھوٹی سی کھوٹی میں ہیں۔ بازار میں سبزیاں بیچتے ہیں۔"

البرٹ کے اوپر لرزاں سی طاری ہوئی۔ گھر کا دروازہ کھل چکا تھا۔ نور الدین گھر میں داخل ہو چکے تھے۔

"گزارا ہو جاتا ہے؟" وہ پوچھے بغیر رہ نہ سکا۔

یاسمین نے لب بھینچ کر مایوس کن سانس خارج کی۔

"کہنے کو تو ہو جاتا ہے۔ ہم سب گزارا کر لیتے ہیں۔ ان اذیتوں کے باوجود ایک دوسرے کی خوشیوں میں خوشیاں تلاش کر لیتے ہیں۔"

پھر یاسمین نے انگلی اٹھا کر ایک بھاگتے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ البرٹ متوجہ ہوا۔

"یہ شمس الرحمٰن۔ صرف بارہ سال کا ہے۔"

بچہ ایک گھر کے سامنے رک کر اپنے یاروں کے کندھے پر ہاتھ ڈال کر باتیں کرنے لگا۔

انگیزشِ عدل

کہیں سے نہ لگتا تھا کہ اسے کوئی غم ہے۔ یا اس کی زندگی نامکمل ہے۔ نامکمل ہوتے ہوئے بھی خود کو مکمل ظاہر کرنا کا ہنر، ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا تھا۔

”جلیاں والا باغ کے حادثے میں اس نے اپنے باپ کو اس چھوٹی سی عمر میں کھو دیا۔ پڑھائی چھوڑ چکا ہے وہ۔ گھر والوں کا پیٹ بھرنے کے لیے دن بھر بازار میں کام کرتا ہے۔“

”کیا کام کرتا ہے؟“ البرٹ پوچھ اٹھا۔

”کپڑے استری کرتا ہے۔ ابھی اپنے یاروں کے ساتھ ہے۔ حالات نے اسے وقت سے پہلے بڑا ہونے پر مجبور تو کر دیا ہے۔ مگر اس کے سینے میں اب تک بارہ سال کے ایک لڑکے کا دل دھڑکتا ہے۔“

البرٹ کی نظریں جھک گئیں۔ وہ اب کسی راہگیر کو دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ اس گلی میں، ان سب کے درمیان اسے اپنا آپ گرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

یاسمین نے پھر ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

وہ دو منزلہ عمارت تھی۔ جس کی کھڑکی سے سر ٹکائے ایک لڑکی کھوئے کھوئے سے عالم میں چاند کو تک رہی تھی۔ البرٹ نے بھی ایک نظر اسے دیکھا تھا۔

”وہ شاہینہ ہے۔ ایک برٹش افسر اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ وہ اس سے شادی کے لیے نہ مانی تو اس کے بھائیوں کو جیل میں بند کر دیا۔“ البرٹ کا دل حلق میں آ گیا۔

یاسمین اداس سا مسکرائی۔ البرٹ اب نظر اٹھا کر اس لڑکی کو بھی نہ دیکھ سکا۔

”اس کے بھائیوں کی رہائی کے بدلے میں، ان افسروں نے اس کی آبرو ریزی کی۔ بھائی مل تو گئے، مگر ان کے جسم بے جان تھے۔ اور وہ زندگی بھر کے لیے تنہا اور رسوا ہو گئی۔ کوئی اسے نہیں پوچھتا۔ کوئی اسے نہیں دیکھتا۔ وہ موت کے انتظار میں زندگی گزار رہی ہے۔“

یاسمین نے گہری سانس خارج کی۔ البرٹ کے اوپر الم کے سیاہ بادل چھانے لگے تھے۔ شہد رنگ آنکھیں مرجھا گئی تھیں۔

"پیاروں کو کھو دینا۔ مال گنوا دینا۔ عصمتیں لٹا دینا۔ ہم ہر اس انہونی سے روز مرہ کی بنیاد پر گزرتے ہیں، جس کا یہ دنیا تصور کر سکتی ہے۔ یہ ہوتا ہے جب ملک پر قبضہ ہو۔ اور قابض حکومت نہیں، ظلم ڈھاتا ہو۔"

اسی اثناء میں یاسمین کا گھر بھی آ پہنچا۔ البرٹ نے نظر اٹھا کر گھر کو دیکھا تھا۔ پھر اس کیاری کو، جس پر سفید پھول لگے تھے۔ انھوں نے فضا کو معطر کر رکھا تھا۔

"فقط یہ کہ البرٹ، ہر گلی میں نہ جانے کتنے نور الدین، کتنے شمس الرحمٰن، کتنی شاہینہ بستے ہیں۔" اس کی آنکھیں چھوٹی ہوئیں۔ لہجہ نہایت نرم۔

"اب سمجھ آ رہا ہے۔ سب سمجھ آ رہی ہے۔" وہ خواب سی کیفیت میں بولا۔ شہد رنگ آنکھیں اب تک مغموم تھیں۔

"یہ ہے حقیقت۔" یاسمین استہزاء سے کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ "اس شہر کی حقیقت یہ ہے۔ ہم سب ٹوٹے ہوئے ہیں۔ جبر اور ظلم سہتے سہتے تھک گئے ہیں۔ اور پتہ ہے ظلم کی ہر حد عبور ہو جانے کے بعد کیا ہوتا ہے؟" اس نے شہد رنگ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال گڑھ دیا۔

"بغاوت۔" وہ آپ ہی بول اٹھا۔

یاسمین پھیکا سا مسکرائی۔ گردن اوپر نیچے ہلی۔

"موت منظور ہے، مگر غلامی منظور نہیں۔" آنکھوں میں شعلے بھڑک اٹھے۔ "اب سمجھ آیا ہم اس دن کیوں اتنے تلخ ہوئے تھے؟"

البرٹ نے گردن اوپر نیچے ہلائی۔

"سب سمجھ گیا۔ آپ کا شکریہ۔ بہت شکریہ۔ میری آنکھیں کھولنے کے لیے، یاسمین۔" آواز ذرا نم ہوئی۔

یاسمین ہنوز پھیکا سا مسکراتی گئی۔

"ہم کبھی تمھیں یہ سب نہ دکھاتے، اگر ہمیں یقین نہ ہوتا کہ تم یہ سب دیکھنا چاہتے ہو۔ اللہ تم پر مہربان ہو۔ خدا حافظ۔" وہ سادگی سے بولی۔

انگیزشِ عدل

آخر میں وہ خوشگوار سا مسکرا دیا۔ یاسمین مڑ کر دروازے میں چابی گھماتے گھر میں چلی گئی۔

جب کہ البرٹ کچھ دیر کھوئے کھوئے سے عالم میں وہیں کھڑا، یاسمین کے پھولوں کی اس خوبصورت کیاری کو دیکھنے لگا تھا۔

رنگوں سے بھرا یہ دیس، ایسی دکھ بھری داستان اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھا؟ وہ کتنی شان سے کہتا تھا کہ اسے سرزمینِ ہند سے محبت ہے۔ وہ غلط کہتا تھا۔ اسے آج احساس ہو رہا تھا۔ محبت تو ان کو تھی جو سڑکوں پر نکلتے تھے، اس دیس کی خاطر اپنی گردنیں تلواروں کو دیے ہوئے ہیں۔ اپنے سینوں پر بلا جھجک گولیاں کھا رہے تھے۔

......☆☆☆......

جب آنکھیں سچ دیکھنا چاہیں، تو بعض دفعہ بہت سی تصویریں جو ہمیشہ خوبصورت نظر آتی تھیں، تاریک اور خوفناک دکھائی دیتی ہیں۔ ہندوستان کی زمین کا بھی کچھ ایسا ہی عالم تھا۔ وہ چمکتا دمکتا، خوبصورت دیس سیاہی میں رنگا ہوا تھا۔ اس کی رونقیں لوٹی جا رہی تھیں۔

اس دن چمنِ گلاب میں معمول کی گہما گہمی تھی۔ باہر سڑک پر قطار در قطار مرد اور عورتیں، ہاتھوں میں بینرز اٹھائے، با آواز بلند نعرے لگاتے سڑک پر چل رہے تھے۔

وہ حسبِ معمول، دن کا پہلا گاہک تھا اور اپنی مخصوص کرسی پر براجمان، اخبار پڑھنے میں محو تھا۔ بلند آوازیں اس کے کانوں میں داخل ہو رہی تھیں۔

"انقلاب زندہ باد۔ برٹش راج مردہ باد۔"

مگر وہ بظاہر ان سب سے بے نیاز تھا۔

اخبار میں روزمرہ کی خبریں نشر تھیں۔ ملک میں کہیں، احتجاجیوں نے پولیس اہلکار کو جاں بحق کر دیا تو کہیں احتجاجی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دن بہ دن، اس دیس کی مٹی میں خون کی ملاوٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ بگڑا ہوا منہ بنائے، کسی پولیس ریڈ کی خبر پڑھ رہا تھا جب اس کے کانوں میں قدموں کی چاپ پڑی۔ کوئی اس کے قریب آ رہا تھا۔

انگیزشِ عدل

سامنے سے، کرسی کھسکنے کی آواز پیدا ہوئی، تو اسے آگہی مل گئی کہ اس کے سامنے کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے اخبار نیچے کیا، تو جیمس کا مسکراتا چہرا اس پر ظاہر ہوا۔ اس کے ہاتھ میں، البرٹ کی کتاب تھی۔

جیمس نے کتاب میز پر پٹخی اور لب ”اوہ“ میں ڈھالے، جیسے کوئی جنگ لڑ کر آیا ہو۔ البرٹ اس کے انداز دیکھ کر، لب کاٹتے مسکرایا۔ وہ جان گیا تھا کہ جیمس پر یہ کیفیت کس باعث طاری تھی۔

”اف البرٹ۔ اف! الفاظ تھے کہ جادو؟“ وہ سحر انگیز کیفیت میں بولا۔ ”جس ڈیٹیکٹو سے اتنی محبت کروائی، آخر میں اسے ہی ولن بنا دیا؟ کوئی اس طرح سے کیسے سوچ سکتا ہے؟

پچھلی سات کتابوں میں ہونے والے قتل، اس نے خود ترتیب دیے تھے! آخر میں کیسے کڑی سے کڑی مل گئی اور ہم قاری تو البرٹ ونسٹن کی حکمتِ عملی کو داد دیتے رہ گئے۔“ اس نے گہرا سانس خارج کیا۔ آنکھیں پر جوش تھیں۔ اس کا لب ولہجہ برطانوی تھا۔

البرٹ کے گال سُرخ ہوئے۔ اسے وہ تمام خطوط یاد آئے، جو اس کتاب کی اشاعت کے بعد موصول ہوئے تھے۔ وہ دبا دبا سا ہنس دیا۔

”اپنے قارئین کو چکمہ دے کر اب تم ہنس رہے ہو؟“ جیمس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

”بالکل! کیونکہ، اپنے قارئین کو بھٹکانے کے لیے ہی تو میں نے یہ کتاب لکھی۔ شروع دن سے ڈیٹیکٹو کا کردار مشکوک تھا لیکن ہر کوئی اس کا مداح تھا۔ اسے ایک ذہین ہیرو کے طور پر تصور کیا جاتا تھا، جب کہ ڈیٹیکٹو دودھ کا دھلا نہ تھا۔ اس کتاب کے بعد میرے قارئین، کبھی دنیا کو پہلی نظر سے نہیں دیکھ پائیں گے۔“ وہ فخر سے بولا۔ اپنے کام کے بارے میں بات کرتے کرتے اس کی چھاتی پھول جاتی تھی اور ہاتھ تیزی سے حرکت کرنے لگتے۔

”درست فرمایا۔ میں تو کبھی اس جھٹکے کے بعد نارمل نہیں ہو سکتا۔“ جیمس نے گہرا سانس لیا۔ اب وہ بالکل نارمل ہو گیا تھا۔

”دن کا آغاز اتنا اچھا ہوا تھا۔ پھر اس احتجاج نے سارا موڈ برباد کر دیا۔“ جیمس نے کوفت کے عالم میں چمنِ گلاب کے بند دروازے کو تکتے ہوئے کہا۔ جس کے پیچھے سے اب تک نعروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"کرنے دو احتجاج۔ احتجاج کا حق ہر آزاد انسان کو ہے۔"

اس بات پر جیمس کی بھنویں اٹھ گئیں۔

"ان احتجاجیوں میں باغی بھی شامل ہیں۔ جو برٹش راج کو آگ لگانا چاہتے ہیں۔ معاف کرنا مسٹر البرٹ، کہیں ان باغیوں سے ہمدردی تو نہیں کر بیٹھے؟" آواز میں ایک لطیف سا تاثر تھا۔ لبوں پر ایک مسکراہٹ۔ بھوری آنکھیں البرٹ کا جائزہ لے رہی تھیں۔

البرٹ اس بات پر کچھ سوچنے لگا۔

"باغی نہیں۔ انقلابی۔ میرے نزدیک یہ لوگ انقلابی ہیں۔ کسی کو نقصان کہاں پہنچا رہے ہیں؟ اپنے حق ہی کے لیے تو لڑ رہے ہیں؟" البرٹ پر اعتماد سا مسکرایا۔ میز پر پڑا اخبار فولڈ کر دیا۔

جیمس زیر لب ہنس دیا۔

"حق؟ کیسا حق، البرٹ۔ کیا تمھیں نہیں پڑھایا گیا کہ برٹش راج ہندوستان اور ہندوستانیوں پر کس قدر مہربان رہی ہے؟ جنگِ عظیم چھڑ گئی، مگر مجال جو ہندوستان کو آنچ آئی ہو۔" وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

"Indians are just ungrateful."

اب کہ البرٹ کے جبڑے تنے۔ جیمس کچھ کچھ محظوظ ہو رہا تھا۔

"پڑھا تھا۔ سنا تھا۔ کہ برٹش راج نے ہندوستانیوں کی زندگیاں بدل دیں۔ لیکن پھر سب خود آنکھ سے دیکھ لیا۔ پھر سمجھ آیا، ہر بتایا جانے والا سچ، سچ کہلانے کے نہیں ہوتا۔" وہ آنکھیں چھوٹی کیے نہایت سنجیدگی سے بولا۔

جیمس نے مصنوعی سے متاثر کن تاثر کے ساتھ لب اوہ میں ڈھالے۔

"اور کس نے کہا عظیم جنگ میں ہندوستانیوں کو آنچ نہیں پہنچی؟ کتنے ہندوستانی سیپائیز جاں بحق ہوئے ہیں۔ افسوس جاں بحق کرنے والی ریاست ہماری ہی ہے۔" وہ مدہم سے اشتعال کے ساتھ بولا۔

"it was collateral damage"

جیمس نے لاپرواہی سے کہا۔ البرٹ کی مٹھیاں بھینچ گئی۔ اسے آگ بگولہ دیکھ کر، جیمس کچھ کچھ سنبھلا۔

"پتہ نہیں ہم بھی کیا لے کر بیٹھ گئے؟ آپ کے نظریات ہیں۔ آپ کو مبارک ہوں۔" جیمس نے موضوع تبدیل کیا۔

"آپ صرف اتنا بتائیں، البرٹ صاحب۔ آپ کو یہ بیکری اتنی کیوں بھا گئی ہے؟" اب کہ اس نے کہنی میز پر رکھی اور گردن جھکائی۔ انداز رازدارانہ تھا اور معنی خیز بھی۔

اس اچانک سے کیے گئے سوال نے البرٹ کو عجیب کیفیت سے دوچار کیا۔ دل ہی دل میں، وہ مشکوک ہونے لگا تھا، مگر اس نے خدشات کو نظر انداز کر کے جواب دیا۔

"بالکل۔ یہاں کی سوغات! تم بھی کھاؤ گے تو دیوانہ بن جاؤ گے۔"

جیمس کی مسکراہٹ اب گہری ہونے لگی تھی۔ البرٹ کا دم کچھ گھٹنے لگا تھا۔ اس آدمی سے اسے برائی کا اندیشہ ہوتا تھا۔

"صرف سوغات میں ہی دلچسپی ہے، یا ماجرہ کچھ اور ہی ہے؟"

البرٹ کی مسکراہٹ بھک سے اڑ گئی۔ وہ پہلے ہی اس سے بمشکل برداشت ہو رہا تھا، اب ناقابلِ برداشت بنتا جا رہا تھا۔

"بالکل۔ مجھے صرف اور صرف ان کیکس پیسٹریز اور بریڈز میں دلچسپی ہے، مسٹر جیمس۔" انداز میں نیم سختی تھی۔

"پکا؟ ایسا تو نہیں کہ چمنِ گلاب کی ملکہ کی وجہ سے کھینچے چلے آ رہے ہو؟"

البرٹ کے چہرے پر ناگواری ابھری۔ دل مضطرب ہونے لگا۔ اسے جیمس کے ارادوں کے پاک نہ ہونے کی آگہی مل گئی تھی۔

......☆☆☆......

چمنِ گلاب کے باورچی خانے میں ہر سو ہر دم چاکلیٹ بسکٹس، بادام کی خطائیوں اور ڈبل روٹی کی مہک پھیلی تھی۔ ان خوشبوؤں کے باعث اس جگہ سے جنت جیسا گمان ہوتا تھا۔

انگیزشِ عدل

یاسمین میز کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کے سامنے تھال تھی جس میں ڈبل روٹی کا آٹا موجود تھا۔ اس کے اضافی ہوا کے بلبلوں کو وہ نکال چکی تھی، اب ان کے پیڑے بنا بنا کر، سانچوں میں ڈال رہی تھی۔ ملازمائیں اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ پس منظر میں وقتاً فوقتاً دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آ رہی تھی۔

”کیسی ہو یاسمین۔“ جنت کی شناسا آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔

”سلام جنت۔ کیسی ہیں آپ؟“ کچھ دیر اپنا کام روک کر سر کو خم دیتے اس نے جنت کو سلام کیا۔

جنت اس کے سامنے ایک کرسی پر براجمان ہوئیں اور میز پر ایک پیالی رکھی۔

”احمد اور حماد کی سالگرہ تھی تو سوچا تمھاری پسند کی، پستے اور بادام والی بھینس کے دودھ کے کھوئے کی مٹھائی لے آؤں۔ کھا کر ضرور بتانا کیسی لگی۔“

یاسمین لبوں پر پھیکی مسکان سجاتے کام میں مشغول ہو گئی۔

”بچوں کو ہماری طرف سے سالگرہ کی مبارکباد ضرور دیجیے گا، جنت۔“ آواز سرد تھی۔

”دے دوں گی۔ دے دوں گی۔“ وہ کہہ کر خاموش ہوئیں۔

کچھ لمحے باورچی خانے میں دروازہ بند کھول ہونے کی آوازیں نہ آئیں۔ بس آٹے کے پیڑوں کی سانچ میں اترنے کی آواز غالب تھی۔

”یاسمین۔ باہر وہ گورا بیٹھا ہوا ہے۔ کیا کام ہے اس کا یہاں؟“ انداز مشکوک تھا۔ ”وہ تو روز ہی یہاں آتا جاتا ہے۔“

”جی جی۔ گاہک ہے وہ۔“ یاسمین نے آٹے کا پیڑا سانچے میں پٹخا اور سرسری انداز میں جواب دیا، جیسے جنت کے انداز کا اس نے کوئی اثر نہ لیا ہو۔ ”روز کچھ خرید تا ہے۔ اخبار پڑھتا ہے اور چلا جاتا ہے۔“

”یاسمین۔ کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہو کہ وہ آدمی نیک نیت ہے؟“

یاسمین نے نظریں اٹھائیں اور بھنویں نیچی کیں۔

”جی بالکل۔ اس نے اب تک کچھ نہیں کیا۔ ہم کسی پر بے جا شک نہیں کرتے۔“ اس نے اپنی طرف سے ایک

تسلی بخش جواب دیا تھا لیکن جنت مطمئن نہ تھیں۔

......☆☆☆......

"برادر۔ تم میرے وطن کے شہری ہو۔ میرے بھائی کی طرح ہو۔ ایک بھائی اب دوسرے بھائی سے اتنا تو کہہ سکتا ہے؟" وہ جان گیا تھا کہ البرٹ کو اس کا انداز بالکل نہ بھایا تھا۔ اس لیے، اس نے بات کو سنبھالنا چاہا۔

البرٹ اس پر خلوص جملے پر مسکرا دیا، مگر دل اب بھی اس آدمی کی موجودگی پر کچھ بے چین تھا۔ وہ کسی بھی طرح سے، یہاں سے چلا جانا چاہتا تھا۔

"غالباً، دل تو کسی پر بھی آ سکتا ہے۔ محبت دھرم دیکھ کر نہیں کی جاتی ہے۔ وہ تو ہندو سے بھی ہو سکتی ہے، سکھ سے بھی۔ اور ایک مسلمان سے بھی۔" اس نے انداز دوستانہ رکھا۔

البرٹ نے جھرجھری لی۔ جیمس کی باتیں اس کے دل میں خلش سی پیدا کر رہی تھیں۔

"نہیں جیمس۔ ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ تم ایک غلط نتیجے پر پہنچے ہو۔"

جیمس نے اسے بھائی کہہ دیا تھا، اس لیے وہ چاہ کر بھی سخت نہ ہو سکا۔ اس کا نرم دل کبھی کبھار اس کی کمزوری بن جاتا تھا۔

......☆☆☆......

"میں تمھیں خبردار کروں گی کیونکہ، تمھاری بڑی بہن ہونے کی بحیثیت اسے اپنا فرض سمجھتی ہوں۔"

یاسمین کا کام کرتا ہاتھ سست ہوا۔

"اس انگریز سے فاصلہ اختیار کر لو یاسمین۔ اسی میں تمھاری عافیت ہے۔" آواز دبی دبی تھی۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں، جنت؟ ہم نے کیا ہی کیا ہے؟" وہ گردن اٹھاتے، متحیر نظروں سے جنت کو تکنے لگی۔

"تم اس دن اس کے ساتھ بگھی میں گئی تھی، یاسمین۔ یہ بات صرف میں ہی نہیں کہہ رہی، ہمارے محلے میں بھی پھیل گئی ہے۔ میں تمھیں شک کا نشانہ نہیں بنا رہی، مجھے تمھارے اوپر بھروسہ ہے۔ لیکن مجھے اس انگریز پر

بھروسہ نہیں۔"

یاسمین نے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اپنی کاٹ دار آنکھوں سے وہ جنت کو دیکھنے لگی۔ پیشانی پر تفکر آمیز لکیریں ابھری تھیں۔

......☆☆☆......

"میں سال پہلے، ایک مسلمان لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔ انجام جانتے ہو کیا نکلا؟ اس نے مجھے دھتکار دیا۔" لہجے میں کڑواہٹ ابھری، چہرے پر کرب جھلکا۔

البرٹ کی نگاہیں ترحم ہوئیں۔

"یہ ایک کڑوی حقیقت ہے کہ یہ ہندوستانی، چاہے مسلمان ہو، ہندو ہو یا سکھ، یہ کبھی بھی ہمارے دوست نہیں بن سکتے۔ یہ کبھی بھی ہمارے اوپر اعتبار نہیں کر سکتے۔ یہ کڑوی حقیقت ہے، جتنا جلدی ہو سکے اس کڑواہٹ کو پی لو، ورنہ میری طرح اپنے لیے تکلیف کا سامان کر بیٹھو گے۔"

البرٹ کی بے قراری اپنے عروج کو پہنچی۔ اسے جیمس شدید کھل رہا تھا لیکن وہ کچھ بھی الٹا سیدھا کہہ کر اسے تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا۔

"جب بھی کوئی آفت آئے گی، تو یہ ہمیں ہی قصوروار ٹھہرائیں گے۔ خود مظلومیت کا لبادہ اوڑھ کر سڑکوں پر نکل آئیں گے۔ یہی تو ان کا مسئلہ ہے، چاہے آفت ان کی خود کی گڑھی ہوئی ہو، یہ کبھی بھی اپنی غلطی نہیں مانیں گے، اپنی عدم اعتباری کا نشانہ ہمیں بنائیں گے۔ یہ ان کی فطرت میں ہے، البرٹ۔"

البرٹ نے نظریں نیچے کر لیں۔ جیمس کی شدت پسند باتیں اسے جواب دینے لائق بھی نہ لگیں۔ وہ کیوں ایسے جانبدار اور نفرت آمیز نظریے پر اپنے الفاظ ضائع کرتا؟

"میں تو تمھیں مستقبل میں ملنے والی تکلیف سے بچانا چاہ رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا تم بھی کبھی وہی سب جھیلو جو میں نے جھیلا تھا۔" جیمس اپنا خاکی یونی فارم جھاڑتے کھڑا ہوا۔

وہ جانے لگا، البرٹ کی اٹکی سانسیں جاری ہوئیں۔

''ٹھیک ہے پھر۔ اپنا خیال رکھنا۔'' البرٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے وہ وہاں سے چلا گیا۔

البرٹ نے ایک گہرا سانس بھرا جیسے دنیا کی تمام آکسیجن اسے اسی وقت ملی ہو۔

دماغ میں طرح طرح کے شکوک وشبہات جنم لینے لگے تھے لیکن یہی سوچ کر اس نے خود کو پرسکون کر لیا تھا کہ عنقریب اس کا یہ قیام ختم ہونے والا ہے۔ اسے بس اپنی کتاب پر توجہ دینی ہے۔ جیمس کی باتیں، بے بنیادی ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے دل کو تسلی دی۔

......☆☆☆......

''لیکن۔۔۔ شاید البرٹ کچھ مختلف ہے۔'' وہ ایسے بولی جیسے خود بھی اپنی بات پر دورائے کا شکار ہو رہی ہو۔

''نہیں یاسمین! یہ سب ایک جیسے ہیں۔'' وہ اب کھڑی ہوئیں۔ سرگوشانہ انداز میں سلسئہ کلام جوڑا۔

''سب کے سب ایک جیسے ہیں! وہ بھی اس جنرل ڈائر کی نسل کا ہے جس نے جلیاں والا باغ میں گولیاں چلوائی تھیں!'' اب کہ لہجے میں کڑواہٹ بھرنے لگی تھی۔

یاسمین کی نظریں بے ساختہ جھک گئیں۔ جلیاں والا باغ سانحہ ان سب کی دکھتی رگ تھا۔

''کیا لگتا ہے تمھیں؟ کیا تم کر سکتی ہو اس پر اعتبار؟ اپنے دل سے رائے طلب کرو۔ جب اسے دیکھتی ہو، تو یہ خیال نہیں آتا کہ وہ تم سے مفاد پرستی کی بنیاد پر جڑا ہے؟ یاسمین۔ ہم اتنی آسانی سے ان کے آگے نہیں جھک سکتے ہیں۔''

ان کی تیز چلتی سانسیں یاسمین کو سنائی دے رہی تھیں۔ جنت پیچھے ہوئیں۔ چہرا جذبات کی شدت سے لال بھبو کا ہو چکا تھا۔

''تم ایک بڑے مقصد کو لے کر لڑ رہی ہو۔ ہمارے پیچھے ہماری عوام ہے۔ سوچ لینا۔ کہیں ایک گورے انگریز کی وجہ سے تم اس عوام سے دغانہ کر بیٹھو۔''

اسے خود سے دور جاتی قدموں کی چاپ سنائی دی، اور پھر دروازہ ٹھپ سے بند ہو گیا۔ وہ کسی بت کی طرح، اپنی جگہ پر منجمد رہی۔ دماغ ایک خدشے سے دوسرے خدشے کا سفر طے کر رہا تھا۔ جنت کی باتوں نے اسے مضطرب کر دیا

تھا۔

"اپنے دل سے رائے طلب کرنا یاسمین۔" یاسمین کو جنت کا جملہ یاد آیا۔

ان کی پیش کش پر عمل کرتے اس نے دل سے رائے طلب کی۔

نظریں اٹھائیں۔ دماغ میں ایک کے بعد ایک منظر آتا گیا۔ البرٹ کا پہلے دن اس بیکری میں آنا۔ اس کی شہد رنگ آنکھوں کا خفگی ظاہر کرنا۔ اس کا اپنے لیے بھلا چاہنا۔ اس کا اپنی قوم کے لیے سچ سننا، نہ صرف سننا اسے قبول کرنا۔ اس کا اپنی غلطی تسلیم کرنا۔

جھول کہاں تھا؟ کہاں البرٹ نے کچھ بھی غلط کیا؟ وہ ماضی کی یادیں کریدتی گئی، کہ کہیں اسے کوئی ایسا لمحہ مل جائے، کوئی ایسی یاد مل جائے جس میں البرٹ نے کچھ بھی قابلِ اعتراض کیا ہو۔ مگر اس تلاش میں اسے کچھ بھی نہ مل سکا۔

دل سے بس ایک ہی آواز رونما ہو رہی تھی۔

البرٹ مختلف ہے!

......☆☆☆......

رات کی سیاہی میں، بادلوں نے آسمان پر چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ بادلوں کی ان ٹولیوں کے پسِ پشت، بدر چھپن چھپائی کھیل رہا تھا۔

نیم ٹھنڈی مگر خشک ہوائیں اس گلی سے گزر رہی تھیں، جس کے دائیں اور بائیں طرف، بھوری عمارتیں کھڑی تھیں۔ اس نے کندھے پر بھورا پرس لٹکایا ہوا تھا۔

ہوا کا جھونکا اس کے وجود سے ٹکرایا تو اس کا دوپٹہ لہرایا۔ اس نے بلا تاخیر اسے درست کیا۔ گلی میں سکوت طاری تھا، بس اس کے قدموں کی چاپ پر ہی سکوت ٹوٹتا۔

اس سے فاصلے پر، وہ ایک گلی سے سر ٹکائے اسے دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں جانچ پڑتال کا ازلی تاثر لیے، وہ محتاط ہو کر چل رہا تھا۔

وہ جیسے ہی ایک گلی سے دوسری گلی میں سفر کرتی وہ چلنا شروع کرتا اور اس کے قدموں کا تعاقب کرتا۔ وہ اونچی سانس لینے سے بھی گریز کر رہا تھا۔

دفعتاً وہ ایک گھر کے باہر رکی۔ گردن ہمیشہ کی طرح ترشان اکڑی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ کی مٹھی بنائی اور دروازے پر دستک دی۔ اسی وقت اس کا ڈھیلا ڈھالا کرتا ہوا کے جھونکے سے لہرایا۔ کچھ دیر میں دروازہ کھل گیا۔

بوڑھے وجود نے مسکرا کر سیدہ یاسمین مجاہد کا استقبال کیا اور وہ تحکم سے گھر کے اندر داخل ہوئی۔

تعاقب کار نے جیب میں ہاتھ ڈال کر واکی ٹاکی نکالی۔ اب کہ اس کا خاکی یونی فارم زرد روشنی میں واضح ہوا اور اس کے سینے پر لگا بیج بھی۔ جس پر اس کا نام درج تھا۔ بلاشبہ، وہ جیمس تھا۔

"ولیم۔ یہاں پہنچ جاؤ۔ آج تو یہ پکڑی جائے گی۔" اس نے واکی ٹاکی میں معنی خیز سرگوشی کی، اور اسے جیب میں ڈال کر لبوں پر فتح کن مسکراہٹ سجائی۔

......☆☆☆......

کمرے میں، کھڑکی کے ساتھ ایک بستر تھا، جس پر بوڑھا وجود سیدھ میں لیٹا ہوا تھا۔ ان کے سرہانے کرسی پر یاسمین براجمان تھی۔ کمرے کی فضا میں پراسرار خاموشی تھی۔

یکبارگی یاسمین کے چہرے پر تبدیلی آئی۔ اس کے لبوں پر مبہم، مگر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے ہاتھ کی مٹھی ہوا میں بلند کی۔

"ایک!" انگشت شہادت نکالی۔

"دو۔" دوسری انگلی نکالی۔

"تین!" تیسری انگلی مٹھی سے آزاد ہوتے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

جہاں وہ زیر لب ہنس دی وہاں وہ بوڑھا وجود متاثر کن نظروں کے ساتھ مسکرا دیا۔

اس نے چہرے کے تاثرات بحال کیے، اور دروازے کا رُخ کیا۔ دروازہ کھولا تو دو شناسا چہرے نمایاں ہوئے۔ وہ جیمس اور ولیم تھے۔ جیمس سربراہی کر رہا تھا، اور یاسمین کو جتاتی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

"امید کرتا ہوں آپ خیریت سے ہوں گی، لیڈی۔" لب تپاتی مسکراہٹ میں پھیلے۔

یاسمین نے چہرے کو سرد سپاٹ رکھا۔

"میں تلاشی لینے آیا ہوں۔" وہ مسکراہٹ سمیٹتے، اپنی گردن کو ترچھی کرتے بولا۔ پھر وہ اس کے کانوں کی طرف جھکا۔

"میں شیر ہوں لیڈی۔ شیر سی جبلت رکھتا ہوں۔ اس وقت شکار کو جھپٹتا ہوں، جب اسے دور دور تک کوئی گمان نہیں ہوتا۔" گردن سیدھی کیے وہ ہنس دیا۔

مگر خلافِ توقع یاسمین کا چہرا عام رہا۔ جیمس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ اسے اندر ہی اندر چبھن ہوئی۔

"یہ تو تھوڑی دیر میں پتہ چل جائے گا کہ آج کون شکار ہو رہا ہے، کون نہیں۔ آپ کو تلاشی لینے کی اجازت ہے۔" اس کا ٹھنڈا ابر فیلہ، مگر پر اعتماد انداز جیمس کو متذبذب کر گیا تھا۔

اس نے ایک اچٹتی نگاہ یاسمین پر ڈالی۔ پھر مڑ کر ولیم کو دیکھ کر اشارہ کیا۔

تلاشی کا سلسلہ شروع ہوا۔ جیمس اور ولیم نے گھر کا کونا کونا چھان مارا، درازیں کھنگالی، الماریاں خالی کیں، یہاں تک یاسمین کا پرس بھی چھان لیا۔ مگر افسوس، ان دونوں کو وہاں کچھ بھی قابلِ اعتراض نہ ملا۔

ہار تسلیم کر کے، ولیم کے سنگ وہ واپس کمرے میں آیا۔ اس کی کڑوی کسیلی نگاہ کا، یاسمین کی سرد نظروں سے تبادلہ ہوا۔

"اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ زیادہ دیر آزاد رہ پائیں گی، تو یہ آپ کی بھول ہے، لیڈی یاسمین۔ جیمس جس کے پیچھے پڑ جائے، اسے بخشتا نہیں ہے۔" اس نے دھمکی آمیز مسکراہٹ، یاسمین کی جانب اچھالی۔ پیشانی تر تھی۔ مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔

"ہم آپ کا انتظار کریں گے۔" یاسمین نے بدستور روکھے پن کے ساتھ جواب دیا۔

جیمس نامحسوس انداز میں پیر پٹختے وہاں سے چلا گیا۔ مگر اب یاسمین کو سلاخوں کے پیچھے بھیجنے کا یہ حکم، ایک حکم سے زیادہ انا کا مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ ایک ہندوستانی عورت سے مات نہیں کھا سکتا تھا۔

انگیزشِ عدل

ان کے جانے کے بعد یاسمین غسل خانے میں بند ہوئی۔ اس نے اپنا کرتا اٹھایا۔ اس کی کمر کے گرد کپڑا بندھا ہوا تھا، جس کے اندر کاغذات کے پلندے تھے۔

وہ ان کاغذات کے ساتھ کمرے میں لوٹی، انھیں میز پر پٹختے کرسی پر براجمان ہوئی۔

سیاہ آنکھیں کسی فکر کے باعث چھوٹی ہوئیں۔

بوڑھا وجود، اس کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا۔

”اکبر چچا۔ ہمارا تعاقب ہونے لگا ہے۔ اور تو اور ہمیں گرفتار کرنے کی کوشش یہ لوگ پہلے بھی کر چکے ہیں۔ کیا اگلی باری ہماری ہے؟“ اس کی آنکھیں سوچ سے چھوٹی ہوئیں۔

بوڑھے اکبر نے اس لڑکی کو اوپر سے نیچے دیکھا۔ وہ ان کی آنکھوں کے سامنے بڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے اسے تبدیل ہوتے دیکھا تھا۔ کڑوا اور تلخ بنتے دیکھا تھا۔ اور اس کے کرخت چہرے کو دیکھ کر، انھیں ایک بار پھر پرانی یاسمین یاد آئی۔ آنکھوں میں کچھ چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

”بغاوت ثابت ہو جائے، تو سزا موت ہے۔ ہم نے کتنوں کو مرتے دیکھا ہے۔“ اکبر کی لرزتی آواز یاسمین کے کانوں سے ٹکرائی۔

یاسمین کے دل میں ارتعاش پیدا ہوا۔

”ظالم آسانی سے نہیں مارتے۔ مارنے سے پہلے ہنٹر سے پیٹ پیٹ کر جسموں کو چھلنی کرتے ہیں۔ پھر زنجیروں سے باندھ کر کسی کتے کی طرح گھسیٹ کر مقتل میں کھڑا کرتے ہیں۔ ڈھیروں افسر ایک ساتھ نشانہ باندھ کر اس باغی کے جسم میں اتنے سوراخ کرتے ہیں کہ وہ پہچانا بھی نہیں جاتا۔“ اکبر ذرا اٹھ کر بیٹھے۔ چہرے پر تلخ اور کڑوی مسکراہٹ ابھری۔

یاسمین کچھ سوچ کر پلک جھپکانے لگی۔ پھر اس نے سرد مہری سے اکبر کو دیکھا۔

”کیا آپ ہمیں ڈرانا چاہتے ہیں؟“ وہ سینا پھلا کر بولی۔

”نہیں۔ ہم صرف جاننا چاہتے ہیں کہ، کیا آپ کو ڈر نہیں لگتا، بیٹی؟ آگے ایک طویل زندگی آپ کی منتظر ہے۔“

انگیزشِ عدل

آواز میں لغزش تھی۔

سیاہ آنکھوں کی سختی فنا ہوئی۔ وہاں محرومیاں تھیں۔ ٹوٹی ہوئی آس تھی۔ ٹوٹے ہوئے خواب تھے۔ زخمی دل کی فریاد تھی۔ انہونیوں کی داستان تھی۔

کیا کچھ تھا ان سیاہ آنکھوں میں؟

"خوفزدہ وہ ہوتے ہیں جن کے پاس کھونے کو کچھ ہوتا ہے۔ ہم نے تو اپنے باپ بھائیوں کو جلیاں والا باغ میں کھو دیا اور۔۔۔" گلے میں آنسو کا پھندا اٹکا، تو وہ آگے کچھ نہ بول سکی۔ آنسو بہنے کی تمنا کر رہے تھے، مگر ان کی خواہشات کو ٹھوکر کیسے مارنی ہے، وہ اتنے عرصے میں تو سیکھ ہی گئی تھی۔

وہ یک ٹک اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ جو وہ کہنا چاہتی تھی، وہ جانتے تھے۔ ماضی کے زخم ایک بار پھر کریدے گئے تھے۔ لالٹین کی زرد روشنی میں نہایا کمرہ، پرفسوں ہوا چلا تھا۔

اب کہ اکبر کی مسکراہٹ اپنائیت سے دوچار ہوئی۔

"جو اپنا سب کچھ ہار کر زندگی دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ وہی اصل فاتح ہوتے ہیں، یاسمین۔ ہندوستان آزاد ہو یا نہ ہوں، ہندوستانی یہ جنگ تو پہلے ہی جیت چکے ہیں۔" ایک توقف لے کر سانس لی۔

"اللہ تمھیں ایک لمبی زندگی دے، یاسمین!" اب کہ ان کی آواز رنجیدہ ہوئی۔

اس نے اپنی آنکھوں میں سرد مہری طاری کی۔ وہ خود کو جذبات میں بہہ جانے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

"ہماری لمبی زندگی معنی نہیں رکھتی ہے۔ لیکن ہمارا مقصدِ آزادی معنی رکھتا ہے۔ اور اس مقصد کو تکمیلیت تک پہنچانے کے لیے، ہم ہر حد عبور کر سکتے ہیں۔" انداز شعلہ باز تھا، مگر آنکھیں برف کی طرح ٹھنڈی۔

اکبر نے سرد سانسیں خارج کیں۔ آنکھوں میں مایوسی کا گزر ہوا۔

"کیا آزادی کے خواب اب بھی دیکھنے چاہییں، یاسمین؟ اپنے دل سے پوچھیں، کیا آپ کے دل میں، اب بھی امید کی شمع روشن ہے؟" وہ مایوس کن لہجے میں بولے۔

یاسمین کے چہرے پر خون دوڑا۔ اس کے گال سُرخ ہوئے۔ سیاہ آنکھوں میں جنون اتر گیا۔

"بالکل!" گردن تن گئی۔ پیشانی پر نسیں بھڑک اٹھیں۔ "ہمارے دل میں اب تک امید کے دیے روشن ہیں۔ اور پتہ ہے ان دیوں میں ایندھن کا سامان کون بنتا ہے؟ ہمارے لوگوں کا خون۔" وہ سینا پھلا کر، آواز میں جارحانہ تاثر سجائے بولی۔ "وہ خون اس دیے کو لازوال روشنی بخشتا ہے، اکبر چچا۔ ہمارے لوگوں کا خون اتنا سستا نہیں کہ ہم اس مقصد کو، یوں مایوسی کے شکنجوں میں گرفتار ہو کر بھلا بیٹھیں۔" اس نے انگشتِ شہادت سے سینے پر دستک دی۔

اکبر کی گردن غیر دانستہ جھک گئی۔ پھر جب نظر اٹھا کر دیکھا تو سیاہ آنکھوں میں نمی دکھائی دی۔

"آئندہ خود کو مایوسی کی اس گھاٹی میں نہیں اترنے دیجیے گا۔ وعدہ کریں۔ آج کے بعد ان آنکھوں کو آزادی کے خواب سے محروم نہیں کریں گے۔"

اکبر نے سر اوپر نیچے ہلایا۔ یاسمین پیچھے ہوئے۔ چہرے کا تناؤ ڈھیلا ہوا۔ اس نے مڑ کر میز پر پڑے، کاغذات کے پلندے کو دیکھا۔

"ہم نے یہ پوسٹرز بنوا لیے ہیں۔" وہ مدعے پر آئی۔ "اگر انھیں لگتا ہے کہ ہم جلیاں والا باغ کے بعد، اپنے خاندانوں کو گنوا کر سڑکوں پر نکلنا چھوڑ دیں گے تو یہ ان کی بھول ہے۔ ہمیں پھر سے جمع ہونا ہو گا۔ ہم پھر سے گلیوں میں نکلیں گے۔ آپ یہ تمام پوسٹرز، کل بازاروں میں بانٹ دیجیے گا۔"

کہہ کر اس نے سر پر دوپٹہ درست کیا۔

"ہو جائے گا، یاسمین۔ سب ہو جائے گا۔" آواز رقت آمیز تھی۔

اس نے سرد مہری سے گردن اوپر نیچے ہلائی۔

حالات نے اسے شدت پسند بنا دیا تھا اور وہ بھی اس شدت پسندی کو اپنا چکی تھی۔

"ہم اجازت چاہیں گے۔ اللہ حافظ۔" وہ مڑ گئی۔

بستر پر لیٹا وہ بوڑھا وجود آنکھوں میں اضطراب لیے اس لڑکی کو دیکھتا گیا۔ دل سے اس کے ایک ہی دعا نکلی کہ اللہ یاسمین کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔

......☆☆☆......

انگیزشِ عدل

جمعے کا مصروف دن امرتسر کے باشندوں کو سلام پیش کر رہا تھا۔

ہمیشہ کی طرح سیدہ یاسمین مجاہد کو اپنی "بہنوں" سے ملنے جانا تھا۔ رشید کی صحتیابی میں وقت درکار تھا اس لیے آج بھی البرٹ نے اسے مدد کی پیشکش دی۔ جو کہ اس نے، ہچکچاتے ہوئے منظور کر لی۔ پچھلی بار کے برعکس، آج وہ جلد مان گئی تھی۔

البرٹ نے ساری بوریاں ایک بگھی میں منتقل کیں۔ مگر اس بار وہ کچھ جلدی تھک گیا تھا۔ اور آخری کی تین بوریاں دونوں نے مل کر بگھی میں ڈالیں۔

وہ دونوں دوسری بگھی میں سوار ہوئے۔ اس بار یاسمین غیر آرامدہ نہ تھی۔ شاید البرٹ سے اب اسے کوئی خدشہ لاحق نہ تھا۔

گھوڑوں کی مخصوص ہنہناہٹ فضا میں گونجی اور بگھی جھٹکا کھاتے چل پڑی۔

"تمھاری کتاب کہاں تک پہنچی۔" اس کو تجسس ہوا تھا۔

البرٹ کی شہد رنگ آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر ابھرا جیسے وہ یک دم پریشان ہو گیا ہو۔

"میں اپنی کتاب کا اختتام تلاش کر رہا ہوں۔ لیکن میں اسے ڈھونڈنے سے قاصر ہوں۔"

یاسمین کی آنکھوں میں الجھن در آئی۔

"ہم سمجھے نہیں۔"

"اب کیسے سمجھاؤں۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "دیکھیں۔ ہر کتاب کا ایک اختتام ہوتا ہے۔ فکشن کا اختتام یا تو خوشحال ہو جاتا ہے، یا تو ہم سب کو ہی مار ڈالتے ہیں۔ اب میں اپنے سفر نامے کا اختتام لکھنا چاہ رہا ہوں لیکن سمجھ نہیں آ رہا۔ آس پاس کسی ایسے شے کا متلاشی ہوں جو مجھے ایک پر اثر اختتام لکھنے پر آمادہ کر دے۔"

اس کے چہرے پر پھیلی تفکر کی لکیری دیکھ کر وہ زیر لب کھل کھلا دی۔ البرٹ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"آپ ہنستی بھی ہیں؟" وہ شریر مسکراہٹ سجائے گویا ہوا تو یاسمین اور بھی زور سے ہنس دی۔

"ہم نے ہنسنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر اب۔" وہ کہتے کہتے کسی سوچ کے تحت خاموش ہوئی۔

شہد رنگ آنکھوں کی شرارت فنا ہوئی۔ وہ ان سیاہ آنکھوں میں گھلتی سنجیدگی کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”اب؟“

”اب ہنسنے کا جی چاہتا ہے۔“ وہ سرد مہری سے بولی، جیسے دماغ نے ایک بار پھر تبدیلی کی نفی کی ہو۔ کیسا عجیب عمل تھا ناں؟ دل کچھ اور کہتا تھا اور دماغ کچھ اور۔

”میں تو کہتا ہوں آپ جی بھر کر ہنسا کریں یاسمین۔ مسکرایا کریں۔ زندگی خوبصورت ہو جائے گی۔“

یاسمین نے اسے مڑ کر دیکھا۔ اس کی شہد رنگ آنکھیں کسی بھی طرح کے داغ و دھبے سے پاک تھیں۔ ان میں کوئی بری نیت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ موسمِ سرما کی ان کرنوں کی مانند تھا جو کہ روح کا گوشہ گوشہ پرسکون کر دیتی تھیں۔

”تم واقعی اتنے خالص ہو یا بننے کا ناٹک کرتے ہو۔“ وہ اسے دیکھتے استفہامیہ انداز میں بولی۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اس نے مذاق کیا تھا یا دل کی گہرائیوں میں بسے وسوسوں کا ذکر کر بیٹھی تھی۔

”یہ تو آپ اپنے دل سے پوچھیں۔ کیا میری خوش اخلاقی ناٹک لگتی ہے آپ کو، لیڈی یاسمین؟“ وہ چہرے پر تبسم سجائے بولا۔

یاسمین نے گردن موڑ کر آنکھیں چھوٹی کیں۔ کیا واقعی، یہ ہنسنا مسکرانا، یہ خوش اخلاقی، خوش کلامی سازش سے پاک تھی؟ اگر واقعتاً یہ سب ایک ناٹک تھا، تو بلا کا شاندار تھا۔

شام کی نیلاہٹ منظر سے سرک گئی اور رات کی سیاہی آسمان پر غالب آ گئی۔

وہ دونوں فارغ ہو چکے تھے اور واپسی کی سفر پر گامزن تھے۔ اس دفعہ البرٹ کو یاسمین کے اندر بعض تبدیلیاں نظر آئیں۔ وہ دبا دبا سا مسکرا دیتی تھی۔ دوسروں سے نرمی سے گویا ہو جاتی تھی جیسے اپنے غم کے بنائے اس پنجرے سے آہستہ آہستہ رہائی پا رہی ہو۔ جہاں اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی وہاں دل میں افسوس بھی ہوتا تھا۔

یاسمین تو اس کے سامنے صرف ایک مثال تھی، نہ جانے اور کتنے ہندوستانی ہوں گے، جو اسی کیفیت سے دوچار ہوں گے، جنہوں نے ہنسنا مسکرانا خود پر حرام کر دیا ہو گا؟

کوئی بھی انسان خوشیوں سے محروم ہو جانے کا حقدار نہیں!

”ویسے یاسمین۔ آپ کے کیکس اور بسکٹس کی تراکیب مل سکتی ہیں؟ میں انگلینڈ جا کر انھیں بناؤں گا ضرور۔“ بگھی یاسمین کے گھر کی جانب روانہ تھی۔

”کبھی کسی ساحر کو اپنے راز بتاتے دیکھا ہے تم نے؟“ وہ اسے دیکھتے سرد سے لہجے میں بولی۔

”نہیں دیکھا۔ البتہ آپ جادوگر نہیں بلکہ ایک بیکر ہیں، تاہم مجھے ساری تراکیب بتا دیں۔“ وہ جیسے ضد کرنے لگا۔

”اب ہمیں یقین ہو اچلا ہے کہ تم نے ناٹک رچایا ہے۔ اور حکمتِ عملی اتنی بھیانک بھی نہیں۔ پہلے امر تسر کی بہترین بیکر سے خوش اخلاقی سے پیش آئے اور پھر تراکیب کا مطالبہ آگے رکھ دیا۔“ وہ شریر سے انداز میں طنز کرنے لگی۔

”اوپس۔ آپ نے تو میرے منصوبوں کو ناکام کر دیا! چچ چچ!“ وہ خفت میں لب بھینچ کر بولا۔

یاسمین زور سے ہنس دی اور وہ خاموشی سے اس کے ہنستے چہرے کو دیکھنے لگا تھا۔ جب سیاہ آنکھیں، خوشیوں سے بھر جاتی تھیں، تو بہت خوبصورت دکھائی دیتیں۔

ہاں وہ اقرار کر رہا تھا۔ اسے وہ سیاہ آنکھیں خوبصورت لگی تھیں۔

”اگر آپ اجازت دیں تو بگھی بازار کی جانب لے کر جا سکتے ہیں؟ مجھے کچھ لینا ہے۔“ وہ کچھ دیر بعد بولا۔

یاسمین نے اجازت دی تو بگھی بان نے بگھی بازار کی جانب دوڑائی۔

بازار پہنچ کر البرٹ بگھی سے اترا۔ ہاتھ میں ایک گملا لے کر وہ بگھی پر سوار ہوا۔

یاسمین ان پودوں کو متجسس ہو کر دیکھ رہی تھی۔

”یہ پودے؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ آپ کے لیے۔ اس دن آپ کے گھر کے باہر کیاری دیکھی تھی جس میں صرف وہ والے پھول تھے۔ کیا کہتے ہیں انھیں اردو میں؟ ہاں یاسمین!“

انگیزشِ عدل

یکدم یاسمین کی آنکھیں بے جان ہوئیں۔ کچھ دیر پہلے، چہرے پر جو نرمی حائل تھی، وہ سفاک تناؤ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ البرٹ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"اس میں یہ لال گلاب بھی لگائیے گا۔ دونوں رنگ، سفید اور سُرخ خوبصورتی کا امتزاج پیدا کریں گے۔" وہ اپنی دھن میں کہہ رہا تھا۔

یاسمین اب بگھی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ البرٹ نے اسے مڑ کر جواب طلب نگاہوں سے دیکھا لیکن اس کی بے رونق آنکھیں دیکھ کر وہ مایوس ہو گیا۔ کون سی شے تھی جو بار بار ان آنکھوں کی رونق کھا جاتی تھی؟ وہ کون سی یادیں تھیں جو اسے اس قدر تکلیف بخشتی تھیں؟ کاش وہ جان سکتا۔۔۔ کاش!

بگھی یاسمین کی گلی میں رک گئی تھی۔ یاسمین اترنے لگی تھی۔

"یہ گلاب کے پودے لے جاتیں تو دل کو اچھا لگتا۔"

یاسمین کا انھیں اپنے ساتھ لے جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن ایک نظر البرٹ کی ان اصرار کرتی آنکھوں کو دیکھ لیا۔ اس نے اس خطاء پر خود کو سرزنش کیا۔ کیا تھا کہ وہ اب انکار کر کے ان آنکھوں کو اذیت دینا نہیں چاہتی تھی۔ البرٹ کی دلکش آنکھیں صرف خوشیوں سے بھری اچھی لگتی تھیں۔

ہاں وہ اقرار کرتی تھی، اسے وہ شہد رنگ آنکھیں دلکش لگی تھیں۔

بنا کچھ بولے، اس نے وہ گملا ہاتھوں میں تھام لیا۔ یاسمین نے نیم بیدار سے عالم میں بٹوے میں ہاتھ ڈال کر سکے نکالے تب ہی اس کے ہاتھ کی پشت سے ایک کاغذ چپک گیا اور بگھی کے فرش پر جا گرا۔ البرٹ کی اب تک اس پر توجہ نہ گئی تھی۔

وہ اسے گلی میں قدم بڑھاتے خود سے دور جاتے دیکھ رہا تھا۔

آنکھوں میں افسوس تھا۔ آخر کیا ہو گی اس لڑکی کی کہانی جو اس کے اندر سے زندگی کی ہر رمق چٹ کر چکی تھی؟

اب کہ بگھی دوڑنے لگی تو اس نے سر جھٹک دیا۔ نظریں اس تہہ شدہ کاغذ سے جا ملیں۔

اس نے کاغذ اٹھا کر تہیں کھولنا شروع کیں۔

وہ جیسے جیسے اس کاغذ میں لکھے الفاظ پڑھتا، اس کی آنکھوں میں خوف پھیلتا جاتا۔ آخری سطر پڑھ کر اس نے کاغذ نیچے کیا۔ شہد رنگ آنکھوں میں پریشانی کا راج تھا۔ سفید پیشانی شکن آلود اور پسینے میں بھیگ چکی تھی۔ نبض تیز ہو چکی تھی۔

آج رات، البرٹ ونسٹن پر نیند حرام ہو چکی تھی۔

......☆☆☆......

صبح ہونے کی دیر تھی، اور البرٹ سائیکل پکڑ کر چمنِ گلاب پہنچ گیا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ رات بھر اس کی نیند بے ربط رہی ہے۔

وہ بیکری میں ادھر ادھر ٹہل کر یاسمین کا انتظار کرنے لگا۔ ملازمائیں اس کملائے ہوئے سفید مرد کو اتنا بے چین و بے قرار دیکھ کر طرح طرح کے شک وشبہات پال بیٹھی تھیں۔

کچھ دیر بعد دروازے کے اوپر لگی گھنٹی بج اٹھی۔ البرٹ ونسٹن چونک کر مڑا۔

اس کی تلاش ختم ہوئی تھی۔ وہ آگئی تھی، وہ سیاہ آنکھوں والی لڑکی۔ جس کی فکر نے اسے رات سے بے چین کر دیا تھا۔ وہ گندمی رنگت والی لڑکی، جو اس کے اوپر ایسا اثر رکھتی تھی جسے وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سیدہ یاسمین مجاہد تھی، جسے دیکھتے ہی البرٹ کے اندر سکون اتر جاتا تھا۔

یاسمین اس بدحال مرد کو ٹھہر کر دیکھتی گئی۔ اس کے بھورے بال ماتھے پر لاپرواہی سے بکھرے ہوئے تھے۔ شہد رنگ آنکھیں نہایت فرسودہ تھیں۔ وہ کسی اجڑے ہوئے چمن سا لگ رہا تھا۔ اسے حیرت نے گھیرا۔

وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

"یہ سب کیا ہے یاسمین؟" وہ مدہم آواز میں کہہ کر عجلت کے عالم میں اپنی جیب سے کچھ نکالنے لگا۔ یوں جیسے وقت ہاتھ سے نکل رہا ہو، مٹھی سے پھسلتے ہوئے ریت کے ذرات کی طرح۔

یاسمین کے ماتھے پر تشویش کی لکیریں ابھریں۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

انگیزشِ عدل

اس نے وہ کاغذ یاسمین کو تھمایا۔ یاسمین اس کاغذ کو دیکھتے ہی پر سکون ہو گئی۔ ماتھے پر پھیلی لکیر فنا ہوئی اور آنکھیں پر سکون اور شانت ہوئیں۔

"بالکل۔ امر تسر میں ایک اور احتجاج ہونے والا ہے۔ اور اس سلسلے میں آج مسلم کارکنان چمنِ گلاب میں رات کے پہر جمع بھی ہوں گے۔" وہ اسے دیکھ کر سرد سانس خارج کرتے ہوئے اطمینان سے بولی۔

البرٹ بے یقینی کے عالم میں گردن نفی میں ہلانے لگا۔ وہ کتنی آسانی سے یہ سب کہہ رہی تھی؟ وہ کتنی آسانی سے اپنی جان کو یوں خطرے میں ڈال رہی تھی؟ کاش وہ اسی کا خیال کر لیتی؟ بلکہ، وہ اس کا خیال کیونکر کرتی؟

"یاسمین، خود کو اس طرح خطرے میں نہ جھونکیں۔ اگر ہندوستانی احتجاج کر رہے ہیں تو برٹش راج کا جبر بھی بہت سنگین ثابت ہو رہا ہے۔ میں روز خبریں پڑھتا ہوں، روز کسی نئے لیڈر کو وہ لوگ گرفتار کرتے ہیں۔ اپنی جان کو اس طرح خطرے میں نہ ڈالیں، یاسمین۔" وہ نرمی سے التجائیہ انداز میں کہنے لگا۔

یاسمین جامد رہ کر، اس کی شہد رنگ آنکھوں میں دیکھتی گئی۔ اسے نے کہا تھا نا کہ شہد رنگ آنکھیں اس کے باطن کا آئینہ دار تھیں۔ وہ ان شفاف شہد رنگ آنکھوں کے ذریعے اس کے ٹوٹے ہوئے، بنجر باطن کو دیکھ پا رہی تھی۔ وہاں طوفان آیا ہوا تھا، تکلیف کا، کرب کا، الم کا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے اپنے جسم کو کسی نوکیلے شے نے چاک کر دیا ہو۔

"بجا فرمایا۔ ان تمام خبروں سے ہم بھی آشنا ہیں۔" معمول کے برعکس، آج اس نے اپنا انداز نرم رکھا۔ وہ چاہ کر بھی کچھ کڑوا نہ کہہ سکی۔

"لیکن ہم پھر بھی ہم آہنگ ہو کر سڑکوں پر نکلیں گے۔ اپنے خلیفہ اور خلافت کے لیے یکجا ہوں گے۔ اور تمھیں کیا لگتا ہے کہ کیا یہ سب ہمارے لیے دشوار نہیں؟ یوں دھوپ میں اپنے وجود کو تپانا، گلیوں میں دوڑنا، اپنی بھوک پیاس کو بالائے طاق رکھ کر، گھٹتی ہمت اور توانائی کے ساتھ سمجھوتہ کرنا۔ نہیں، یہ مراحل اذیت ناک ہیں۔ ہم سب بار بار اس عذاب سے خود کو گزارتے ہیں، البرٹ۔

تم خود سوچو کہ ہمیں کس قدر بے بس کر دیا گیا ہے، کس قدر مجبور کر دیا گیا ہے، ہمارے جذبات کے ساتھ

کھیل کر ہمیں اس قدر زچ کر دیا گیا ہے کہ اب ہمیں موت، اس قید بھری زندگی سے بہتر لگتی ہے، البرٹ! اب تم بتاؤ، کیا ہم غلط ہیں؟ کیا ہم اور باقی سب جو اس احتجاج میں حصہ لیں گے، کیا ہم غلط ہیں؟ کیا یہ ہمارا حق نہیں۔" وہ نرمی سے اسے قائل کرنے لگی

البرٹ کے ماتھے پر پھیلیں تفکر کی لکیر ڈھیلی پڑی، البتہ آنکھوں کی بے چینی برقرار تھی۔ وہ اسے کیسے سمجھاتا کہ وہ جانتا تھا کہ وہ غلط نہیں۔ یہ تو بس اس کا دل تھا جو سیدہ یاسمین مجاہد کے اوپر خطروں کو منڈلاتے دیکھ کر پاش پاش ہو رہا تھا۔ یہ خیال کہ یاسمین کے سر پر خطرہ منڈلا رہا ہے، اسے اذیت دے رہا تھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے یاسمین۔" شہد رنگ آنکھیں نم ہوئیں۔ ان میں ایک آنسو ٹوٹ گیا۔ "مجھے بس ڈر لگتا ہے۔" وہ صرف اسے دیکھ رہا تھا۔

یاسمین کا دل لرز اٹھا۔ دور اندر کہیں چبھن ہوئی۔ وہ کیوں اداس تھا؟ اور یہ اداسی اس کی اپنی ذات کے لیے باعثِ تکلیف کیوں بن رہی تھی؟ کیوں اس کے اجڑے اجڑے سے حال پر وہ بھی اجڑنے لگی تھی؟ کیوں اس کے مرجھاتے ہوئے کندھوں کو دیکھ کر اس کے لیے بھی کندھے اٹھانا دشوار ہو رہا تھا؟

وہ ان سوالات کے جواب بوجھنے سے قاصر تھی۔ اس کے لیے اپنے چہرے کی سرد مہری برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

"آخر کیا ڈراتا ہے تمھیں، البرٹ؟" وہ کھوئے ہوئے سے انداز میں بولی۔

البرٹ بے بسی سے آنکھیں چھوٹی کیے، اسے دیکھتا گیا۔

"خیال، کھو دینے کا۔ آپ کو کھو دینے کا۔" آواز نم ہوئی۔

اور یہ پہلی بار تھا جب سیدہ یاسمین مجاہد کو البرٹ ونسٹن نے لاجواب کیا۔ وہ آنکھیں پھیلائے اس مرد کو دیکھتی گئی۔ جس کا چہرا فرطِ جذبات سے دہک رہا تھا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں کہ یہ آپ سب کا حق ہے۔ یہ جنگ آپ لوگوں کی ہے اور میں یہی چاہوں گا کہ آزادی آپ سب کا مقدر بنے۔ میں آپ اور آپ کے لوگوں کی سلامتی کے لیے دعا کروں گا۔

بس، اپنا خیال رکھیے گا۔" وہ اداس سا مسکرایا۔ مڑ کر وہاں سے چلا گیا۔

یہ دوسری بار تھا، جب البرٹ ونسٹن نے چمنِ گلاب سے کچھ نہیں خریدا تھا۔

پہلی بار تو یاسمین مجاہد کو فرق نہ پڑا تھا۔ مگر آج، وہ اسے روکنا چاہتی تھی۔ اسے پیچھے سے پکارنا چاہتی تھی۔ اس کے خالی ہاتھ جانے سے اس کے دل میں گرانی کیوں محسوس ہوئی؟

اس پر سانس تک لینا گراں گزر رہا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ یادوں کے یلغار نے دماغ کو دھندلایا۔

"اپنا خیال رکھنا۔" ایک مانوس آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو اسے لگا جیسے کسی نے دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔

زخم پھر سے کھرچ گئے تھے اور روح خون میں نہا گئی تھی۔ آخر کیوں۔ کیوں یہ زخم بار بار کھرچ دیے جاتے تھے؟ انھیں بھرنے کا موقع کیونکر نہ ملتا تھا؟

"یاسمین!" اونچی آواز کانوں سے ٹکرائی تو وہ گہرا سانس خارج کرتے بیدار ہوئی۔ گاہکوں کا رش لگ چکا تھا۔ اس کے عقب میں ایک عورت کھڑی تھی۔

"کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔ سب خیریت تو ہے۔"

اس نے چہرے پر وہی سرد مہری کا خول چڑھایا۔ اپنے ڈھیلے اعصاب پھر سے قابو کیے۔

لیکن اس سب کے باوجود، دماغی خلفشار نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

......☆☆☆......

چائے خانے میں رات کا مصروف ترین پہر چل رہا تھا، اس لیے ہر طرف مردانہ قہقہے، خوش گپیاں سنائی دیں گی۔

البرٹ میز کے گرد بیٹھے، کھوئے کھوئے انداز میں گرما گرم چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ ہاں، آج چائے کچھ بے لذت محسوس ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں؟ یہ خوش گپیاں، یہ رونقیں بھی اس کا دل نہ بہلا سکی تھیں۔ کوئی خدشہ آن چمٹا تھا، جو فراموش نہ کیا جا سکتا تھا۔

یکدم، اسے سامنے سے کرسی کھسکنے کی آواز آئی تو وہ بیدار ہوا۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ سامنے والی کرسی پر

انگیزشِ عدل

جیمس براجمان ہوا تھا۔ جیمس نے اپنے چہرے پر مسکان سجائی اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

البرٹ کے حلق میں کڑواہٹ گھل گئی۔ اس نے بمشکل، ناگواری کو اپنے چہرے پر آنے سے روکا۔ زندگی پہلے سی ہی الجھی ہوئی تھی، دماغ پہلے ہی اتنا بے سکون تھا، اور اب جیمس بھی نازل ہو چکا تھا؟ اس کی سانسیں بے ربط سی ہونے لگیں۔

"کیا حال ہے؟" جیمس نے اس کے اندر پنپتا اضطراب بھانپ تو لیا تھا لیکن فی الوقت اسے اس سب سے کوئی غرض نہ تھا۔ وہ تو خبر رساں تھا۔ خبر سنانے آیا تھا۔ ایک کھیل کو ترتیب دینے آیا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" انداز میں واضح کھچاؤ تھا۔

جیمس بس مبہم سا مسکرا دیا۔ کندھے اچکائے، اور لب کھولے۔ بھوری آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"مسٹر رائٹر، کیا تمھیں خبر ملی؟" مصنوعی خوشگوار مسکراہٹ کی فطرت میں تبدیلی آئی۔ وہ معنی خیز ہوئی۔

البرٹ کے دل کو کسی انجانے خدشے نے گھیرا تھا۔ اس نے بھنویں سکیڑیں۔ شہد رنگ آنکھوں میں پریشانی کی جھلک تھی۔

"کیسی خبر؟" بظاہر لہجہ پرسکون رکھا۔

"چمنِ گلاب۔" جیمس نے لطف اندوز ہوتے کہہ کر، تالی پیٹی اور زور سے ہنس دیا۔ آج وہ برائی کو چھپانے کی کوشش بھی نہ کر رہا تھا۔

چمنِ گلاب کا نام سن کر، شہد رنگ آنکھوں میں شاک کی آمیزش ہوئی۔ سفید ہاتھ مٹھی میں جکڑ گئے۔ اسے جیمس کی غلیظ زبان سے، وہ نام سن کر غصہ چڑھنے لگا تھا۔

"چمنِ گلاب کیا؟" آواز میں لڑکھڑاہٹ اور بے چینی تھی۔ دل ڈوب رہا تھا۔ یکدم اسے تمام خدشات حقیقت کا رنگ لیتے نظر آئے۔

"چمنِ گلاب میں آج ایک پرائیویٹ میٹنگ ہونے والی ہے جب کہ حکومت نے اس طرح کی گیدرنگز پر پابندی لگائی ہوئی ہے۔ معذرت کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے، لیکن تمھیں خاصہ بے وقوف بنایا گیا ہے۔"

البرٹ کرنٹ کھانے والے انداز میں کھڑا ہوا۔

اس نے آنکھوں میں وحشت لیے جیمس کو دیکھا۔ پیشانی پسینے میں تر ہوئی۔ سانسیں گہری ہونے لگیں۔

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" آواز میں دبا دبا اشتعال تھا۔

جیمس نے مسکراہٹ سمیٹ کر البرٹ کے بدلتے انداز پر غور کیا۔ مقابل کھڑے اس شہد رنگ آنکھوں والے مرد کی پریشانی، چہرے پر پنپتی بے بسی، اور آنکھوں میں جھلکتا اشتعال، اسے محظوظ کر رہا تھا۔

"میں تو بس اطلاع دینے آیا تھا۔ ان لوگوں کو لگتا ہے کہ یہ چھپ سکتے ہیں جب کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے احتجاج اسی کے کرائے گئے ہیں۔ حکومت کی خلاف ورزی کریں گے تو ہم بھی اسی مطابق خاطر تواضع کریں گے۔" وہ سینا تکبر سے پھلاتے بولا۔

لحظہ بھر شہد رنگ آنکھوں میں سکوت ابھرا۔ نگاہیں کچھ پر سوز ہوئیں اور پھر پر عزم۔ ان میں خوف کی ہلکی سی رمق دیکھی جاسکتی تھی۔ وہ جیمس کی آنکھوں میں غصیلی نگاہ ڈالتے اس کے عین سامنے کھڑا ہوا۔

کچھ دیر وہ اس بھوری آنکھوں والے مرد کو سانسیں پھلا کر دیکھنے لگا۔ پھر درشت انداز میں اس کی طرف جھکتے اس کے سینے پر انگلی سے دستک دی۔ وہ کسی جنگلی بھیڑیے سی دہشت اپنی شہد رنگ آنکھوں میں سجائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ اس کا یہ روپ دیکھ کر جیمس کی ریل کی ہڈی سنسنا اٹھی۔ کچھ تھا اس کے اندر کہ وہ ڈرا ضرور تھا۔

"اگر یاسمین کو کچھ بھی ہوا ناں، جیمس۔ تو امرتسر کی گلیاں تمھارے خون میں رنگ جائیں گے۔" وہ چبا چبا کر کہتے۔ اس کا ایک جملہ کسی شیر کی غراہٹ سا لگتا تھا۔

جیمس آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ پل بھر میں آنکھوں کی حیرت فنا ہوئی۔ وہ شر سے چمکیں۔ تو معاملہ اتنی سنجید گی اختیار کر چکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ہنس دیا۔ البرٹ اسے تمازت سے اسے دیکھتے ہوئے سیدھا ہوا۔

جیمس کھڑا ہوا، جب کہ البرٹ مڑ کر جانے لگا۔

"آخر کیوں اس کی خاطر مرنے مارنے پر تلے ہو، مسٹر البرٹ۔" انداز تپانے والا تھا۔

البرٹ کے قدم تھم گئے۔ وجود ساکت ہوا۔

"کیوں اس کے لیے اتنا بے چین ہو رہے ہو۔ آخر ایسا کیا ہے تم دونوں کے بیچ؟" لبوں پر عیار مسکراہٹ پھیلی۔

البرٹ کے چہرے پر پھیلا تناؤ ڈھیلا ہوا۔ ہاتھوں کی مٹھی کھل گئی۔ ایسے جیسے کوئی وزن سا جسم سے سرک گیا ہو۔

"جو ہمارے درمیان ہے، شاید اسے لفظوں میں بیاں نہیں کیا جا سکتا۔" آواز دھیمی تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ جسم سے گرم گرم شعائیں پھوٹ رہی تھیں۔

وہ مڑا۔

شہد رنگ آنکھیں سُرخ ہوئیں۔ ان میں پنپتی عقیدت کو دیکھ کر جیمس ایک بار پھر دنگ رہ گیا۔ معاملہ واقعتاً سنگین تھا۔

"سایہ ساتھ چھوڑ جاتا ہے، مگر یاسمین کا خیال میرے ذہن کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔" آنکھیں بھیگیں۔ لب لمحے بھر کے لیے لرزے تھے۔

"میرے بس میں ہو تو میں ایک خول بن جاؤں اور ان کی زندگی بھر حفاظت کروں۔ ایسا کیوں ہے، کب سے ہے۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ مگر جو ہمارے درمیان ہے وہ اتنا خالص ہے کہ تمھارے جیسے کھوٹے انسان کو سمجھ نہیں آ سکتا، جیمس۔" اور اسی پل سُرخ انگارے کی مانند دہکتے رُخسار سے آنسو تیر تا زمین پر جا گرا۔

جیمس لاجواب ہو گیا۔ اس کی آواز میں جو خلوص وہ محسوس کر پا رہا تھا، اس نے اسے جھنجھوڑ دیا تھا۔

البرٹ اسے ناگواری سے دیکھتے چلا گیا اور اب جیمس نے بھی اسے نہ پکارا۔

کچھ دیر جیمس کسی بت کی طرح کھڑا رہا۔ جیسے اب تک وہ البرٹ کے الفاظ کے حصار میں ہو۔

کچھ لمحے لگے اسے، خود کو آزاد کروانے میں۔ پھر وہ سر جھٹکتے باہر جانے لگا۔

آخر کو تماشہ اسے اپنی آنکھوں سے جو دیکھنا تھا۔

کہا تھا نا، اس کے ارادے شیطانی تھے۔

......☆☆☆......

اور یہ تھی چمنِ گلاب کی حقیقت۔

وہ بے ضرر سی بیکری، انقلاب کا ایک نشان تھی۔

دن کے وقت جہاں لوازمات بیچے جاتے تھے، وہاں رات کے وقت امر تسر کے مسلمان اپنے اجلاس و احتجاج کے منصوبے بناتے تھے۔

چھپ کر۔ اپنی بغاوت کے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی تیاریاں کرتے تھے۔

یہ تھی چمنِ گلاب۔ جو عدل کی اس انگیزش میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ جب ظالم قابض ہو جائے تو سر زمین کے باشندے ہی نہیں، اس کی مٹی کا ذرہ ذرہ بغاوت کرتا ہے۔ چمنِ گلاب بھی اسی مٹی سے بنی تھی۔ اسے احساس تھا۔ اندازہ تھا۔ اس مٹی سے اسے عقیدت تھی۔ اس نے عرصہ اس سر زمین کی چیخ و پکار سنیں۔ اسے کٹتے دیکھا تھا۔ اس کا دم گھٹتے دیکھا تھا۔ اس نے اسی سر زمین کی رنگوں کو ماند ہوتے دیکھا تھا۔

اس کا فرض تھا بغاوت کرنا۔ اس نے پناہ دی بغاوت کو، بغاوت کے مقصد کو۔

اور کیا تمھیں یہ لگتا ہے کہ چمنِ گلاب اکیلی تھی؟

ہر گز نہیں۔ تمھیں ہندوستان بھر میں لاکھوں چمنِ گلاب نظر آئیں گی۔ لائبریریاں، دواخانے، اسپتال اور نہ جانے کون کون سی عمارتیں تھیں، جو چمنِ گلاب سے مختلف ضرور تھیں، مگر مقصد وہی تھا۔ بغاوت! آزادی!

اور تمھیں ہندوستان میں لاکھوں یاسمین مجاہد نظر آئیں گی۔ وہ جو جانوں کو خطرے میں ڈال کر، اس مقصد کے لیے بر سرِ پیکار تھے۔

ان سب کے دلوں میں بس ایک ہی مہر ثبت تھی۔

انگیزشِ عدل کی مہر!

......☆☆☆......

وہ اپنی سائیکل سڑکوں پر بھگا رہا تھا۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ دنیا کی ہر پیش رفت سے بیگانہ تھا۔ ذہن پر

صرف یاسمین کی فکر سوار تھی۔

یاسمین کو کھو دینے کا خیال اس کی آنکھ کو بار بار بھگو دیتا۔ منظر دھندلاتا تھا۔ وہ ان آنسوؤں کو ہاتھ سے رگڑ کر منظر صاف کر دیتا۔ وقت نہیں تھا جذبات میں بہہ جانے کا۔ وقت نہیں تھا صدمے میں آ کر خود کو کھو دینے کا۔

اسے صرف سیدہ یاسمین کو بچانا تھا۔ اس کے تحفظ کو یقینی بنانا تھا۔

تاخیر کی قیمت بہت بھاری ثابت ہونی تھی۔

بہت بھاری!

......☆☆☆......

گول دائرے کی صورت پانچ کرسیاں لگی ہوئی تھیں، جن پر وہ لوگ براجمان تھے۔ یہ سب جماعتوں کے لیڈرز تھے، آزادی اور خلافت کی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے مسلمان تھے۔

”تمام پوسٹر زبٹ گئے تھے، اکبر صاحب؟“ یاسمین نے عمر رسیدہ اکبر کو مخاطب کیا۔

”ہاں یاسمین۔ پورے بازار میں تقسیم کر دیے گئے ہیں۔“ انھوں نے سرد مہری سے جواب دیا۔

”یہ احتجاج اب تک کا سب سے پر زور احتجاج ہو گا۔ اگر انھیں لگتا ہے کہ جلیاں والا باغ کے بعد ہم سہم جائیں گے تو محض یہ ایک بھول ہے۔“ آواز میں غضب اتر آیا۔

کمرے میں موجود ایک ایک فرد نے گردنیں اوپر نیچے ہلائیں۔ ان کے چہرے فرطِ جذبات سے دہک رہے تھے۔

زرد روشنیوں میں نہائی بھوری دیواریں بھی اپنی مالکن کو سن رہی تھیں۔

”ہم صدیوں سے اپنی زمین پر ان لوگوں کا قبضہ جھیل رہے ہیں۔“ وہ بلند آواز بولی۔

”مگر اب۔ اب ہندوستان بھی آزادی دیکھے گا۔ ہم جانتے ہیں، ایک صبح ایسی بھی طلوع ہو گی جب ہم آزاد فضا میں سانس لیں گے۔ ہمارے دل سے ایک آواز آتی ہے، جو ہم سے کہتی ہے کہ ہندوستان جلد ہمارا ہو گا۔ ایک وقت آئے گا جب ہمارے لوگ جو چاہیں، کہہ سکیں گے۔ ہمارے لوگ اس ملک کا نظام چلائیں گے۔ ہمارے لوگوں کے

پاس اقتدار ہو گا۔"

سب کے دلوں میں والہانہ پن تھا۔ آزادی کی اس خواہش، اس پیاس اور تڑپ نے ان کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں، کہ سب سے بڑی آرزو زندگی جینے کی ہوتی ہے۔ مگر ایک قیدی کے لیے سب سے بڑی خواہش آزادی ہوتی ہے۔ آزادی نہیں تو زندگی کا ہر تصور مٹ جاتا ہے۔

"کیا ہوا اگر ان کی جدید اسلحے سے آراستہ افواج سے لڑنے کے لیے ہمارے پاس برہنہ تلواریں تک نہیں؟ ہمارے پاس دو ہتھیار موجود ہیں!

ہماری آواز۔

اور خدا کی ذات پر غیر متزلزل یقین۔

اور یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جو ان کی بندوقوں کو خاک میں ملا سکتا ہے۔ ہمیں ثابت قدم رہنا ہو گا۔ ہمیں ہماری ذات سے پہلے اپنے لوگوں کا سوچنا ہو گا، ہماری نسل کا سوچنا ہو گا۔ اگر آج ہم نے اقدام نہ اٹھائے تو ہماری نسل زندگی بھر ان ہی مظالم کا شکار رہے گی۔

یہ ایک کٹھن راہ ہے۔ ایک اذیت ناک تاریک راہ ہے۔ مگر یہ ایسی راہ ہے جس کے اختتام پر آزادی کی کرنیں ہمیں چھوئیں گی۔ جس کے اختتام پر ایک نئی زندگی ہمارے منتظر ہو گی۔ تو کیا ہمیں یہ منظور ہے؟"

اس نے کہہ کر سانس لینے کو وقفہ لیا اور سب کو دیکھا۔ سب نے سُرخ چہروں کو اثبات میں ہلایا۔

"پھر نکالیں اپنی جماعتوں کو سڑکوں پر۔ اور نعرہ بلند کریں! جیے ہندوستان!" وہ بلند حوصلگی کے ساتھ بولی۔

"جیے ہندوستان!" اکبر نے جوابی نعرہ بلند کیا۔

"انقلاب زندہ باد!"

عنقریب پورا چمنِ گلاب نعروں سے گونج اٹھا۔

دیواروں کو خبر ہو چکی تھی کہ یہ نعرے عنقریب معدوم ہو جائیں گے۔ وہ افتاد کی آمد سے باخبر تھیں، اس کے باوجود انھوں نے خاموشی اختیار کی۔

وہ چمنِ گلاب سے بغاوت کر گئی تھیں۔

......☆☆☆......

چر چرانے کی آواز کے ساتھ پولیس کی گاڑی، چمنِ گلاب کے باہر رک گئی۔

اندر سے چار پولیس افسر برآمد ہوئے۔ ان میں سے ایک ولیم تھا۔

ان کے چہروں پر تکبر آمیز تناؤ حائل تھا۔ آج دنگا فساد کرنے والے ایک گروہ کو بے نقاب کرنے والے تھے، اس کی جڑیں کاٹنے والے تھے۔ یہ احساس ان کی انا کو ہوا دینے کے لیے کافی تھا۔

ولیم آگے بڑھا۔ محتاط انداز میں چلتے ہوئے اس نے اپنی گن نکالی، اور دروازے کی طرف تان لی۔

سب پولیس والوں نے اپنی گنز لوڈ کی ہوئی تھیں۔

دروازے پر کھٹکھٹاہٹ ہوئی۔

وہ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ خوف وہراس ان کی آنکھوں پر سمایا ہوا تھا۔ چمنِ گلاب کی اس جوشیلی فضا میں، آہستہ آہستہ خاموش انتشار گھلنے لگا تھا۔

”پولیس نے تمھیں گھیر لیا ہے۔ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر لو۔“

اب کی بار سب کے لب کھلے، حلق خشک ہونے لگے۔ وہ خبر موت کا پیغام دے رہی تھی۔

”یہ کیسے ہوا؟ ہماری میٹنگز کے بارے میں پولیس کو خبر کیسے ہوئے؟“ ایک صاحب حیرت سے بولے۔

یاسمین کا دل ڈگمگایا۔ بھوری بھنویں ستائش سے سکڑ گئیں۔

”یا تو وہ لوگ ہمارے اوپر نظر رکھے ہوئے ہیں، یا پھر۔۔“ جواب دیتے دیتے یاسمین کی رنگت فق ہوئی۔ سینے میں سانپ لوٹے۔ ”یا پھر کسی نے ہمارے ساتھ دغا کیا ہے۔“

سب کے چہروں پر مزید پریشانی در آئی۔

”ہم دس تک گنیں گے۔ اگر تم لوگ باہر نہ آئے تو یہ دروازہ توڑ دیں گے۔“ ولیم دھاڑا تو یاسمین کھڑی ہوئی۔

اس نے جلد از جلد کوئی فیصلہ لینا تھا۔

مشکل فیصلہ۔

”آپ سب کو روانہ ہونا ہو گا۔“

”ایک!“ باہر سے آواز آئی۔

”ہم آپ کے بغیر کہیں نہیں جائیں گے، یاسمین۔“ اکبر صاحب بولے۔ باقی سب نے سر اثبات میں ہلایا۔ یا تو سب ایک ساتھ پولیس کے حوالے ہوں گے، یا کوئی بھی نہیں۔ سب نے پُختہ ارادہ کیا۔

”آپ لوگ سمجھتے کیوں نہیں؟ ہماری گرفتاری ضروری ہے۔“

”دو!“

”وہ یہاں پر صرف ہمارے نام سے واقف ہیں۔ ہمیں گرفتاری دینی ہو گی تاکہ ان کو یہ گمان ہو کہ ان کے ہاتھ کچھ تو لگ گیا ہے۔ آپ سب کو چھپنا ہو گا۔ ان احتجاجوں کو آگے آپ سب نے ہی بڑھانا ہے۔ کیا ہوا اگر چمن گلاب یہ مقصد سرانجام نہ دے سکے؟ ایسی دس چمنِ گلاب ہم کھڑی کریں گے۔“ وہ حتمی انداز میں بولی۔

سب ٹھنڈے پڑنے لگے۔ لیکن اپنی سربراہ کو اکیلے چھوڑ جانا ایک معیوب خیال تھا۔

”تین!“

”مگر یاسمین۔“

”مگر وگر کچھ نہیں۔ یہی ہمارا آخری فیصلہ ہے۔ آپ سب کے پاس، اسے ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“ وہ دروازے کو تک رہی تھی۔

اور وہ سب اسے تک رہے تھے۔ ان سب کے لیے وہ عظمت اور بے غرضی کا پیکر بن چکی تھی۔ وہ جو اس مقصد کے لیے، اس عوام کے لیے خود کو عبرت ناک قید کے حوالے کرنے والی تھی۔

”چار!“

”پچھلے دروازے سے سب روانہ ہوں گے۔“ گردن کرخت ہوئی۔ لہجہ پر تپش۔ ”احتجاج ہر صورت ہو گا۔“ سفاک و پرسوچ خاموشی۔

"پانچ!"

"اب دیر نہ کریں۔ ان لوگوں کا سامنہ کرنے کے لیے ہم ہمیشہ سے خود کو تیار کر رہے تھے۔"

اس نے تحکم سے کہہ کر گردن مزید اکڑائی۔

سب کے چہروں پر آنسو تھے۔ آج وہ اسے قربانی دیتے دیکھ رہے تھے۔ کل کو قربانیاں انھیں بھی دینی تھی۔ تو کیا تمھیں واقعی لگا تھا کہ آزادی بنا قربانی دیے حاصل کی جاسکتی ہے؟

"چھ۔"

یاسمین نے اب چمنِ گلاب کے دروازے کی طرف قدم بڑھانا شروع کیے۔ دل نے ڈبکی لگائی۔ کچھ چیزیں باتوں باتوں میں زیادہ آسان ہوتی ہیں، ان پر عمل پیرا ہونا، کانٹوں پر چلنے کے مترادف ہوتا ہے۔ اپنی قید تک چلنا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

"سات!"

اس کا دل حلق میں آرہا تھا۔ وہ جانتی تھی یہاں سے زندگی ایک تکلیف دہ موڑ لینے والی تھی۔

وہ تیار تھی، ہمیشہ سے خود کو تیار کر رہی تھی۔ اسے لگا تھا کہ وہ بے خوف ہوگئی تھی لیکن نہیں۔ وہ بے خوف نہیں تھی۔

"آٹھ!"

لیکن وہ خوف بے ضرر تھا۔

وہ ان تکالیف کے سامنے کوئی حیثیت نہ رکھتے تھا جو اس کے حریف نے اسے پہنچائی تھی۔

"نو!"

اس نے چہرا پر سکون رکھا۔

"کبھی اپنی گردن جھکنے نہ دینا، یاسمین۔" ایک مردانہ آواز اس کے ذہن میں چکر کاٹنے لگی۔

"دس۔" ولیم نے گن نیچے کی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔

سامنے یاسمین کا رعب دار سا باوقار سراپا تھا۔ آنکھیں بے خوف اور برفیلی تھیں۔
وہ ہر محاذ سے لڑنے کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی۔

......☆☆☆......

اس کی سائیکل چمنِ گلاب کے سامنے رکی۔

آنکھیں وہ منظر دیکھ رہی تھیں، مگر دماغ یقین کرنے سے انکار کر رہا تھا۔ دل جیسے سینے کی سرحدوں کو عبور کرنے میں کوشاں تھا۔

وہ اس کے عین سامنے کھڑی تھی۔

ہاتھ ہتھکڑی سے بندھے ہوئے تھے۔ سیاہ آنکھیں اجڑی اجڑی تھیں۔ گندمی چہرا ہلکان ہو چکا تھا۔ ولیم اسے گاڑی تک لے کر جا رہا تھا۔

البرٹ دم سادھے اسے دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں شکستہ تھیں۔ ان دونوں کی آنکھیں کچھ دیر کے لیے ملیں۔ سیاہ آنکھوں نے مان ظاہر کیا۔ جب کہ شہد رنگ آنکھوں نے دیری پر معذرت طلب کی۔ پھر گویا سیاہ آنکھوں نے اس مرد کو جتایا، کہ اس کا پہنچ جانا ہی کافی تھا۔

"اندر باورچی خانے میں پرنٹنگ پریس بھی ملا ہے سر۔ یہ پامفلیٹس یہیں سے چھپتے تھے۔" پیچھے سے پولیس والے نے صدا لگائی تو ولیم مسکرایا۔ مسکرا کر اس نے البرٹ کو دیکھا۔

البرٹ کو دیکھتے ہی مسکراہٹ معنی خیز ہوئی۔ ایک دم سے البرٹ کو کچھ بہت غلط ہونے کا احساس ہوا۔

"کیسے ہیں البرٹ صاحب۔"

البرٹ ششدر تھا۔ دماغ سن تھا، اس لیے وہ کچھ نہ بولا۔

"ہم آپ کے مشکور ہیں۔ جیمس کو سب درست وقت پر بتانے کے لیے تہِ دل سے شکریہ!"

اس جملے نے البرٹ کے کانوں میں گویا سور پھونک دیا۔ اس نے زور دار جھٹکا کھا کر یاسمین کو دیکھا۔

آنکھیں ایک مرتبہ پھر ملیں۔

البرٹ کی آنکھوں میں نا سمجھی تھی، شاک تھا، بے بسی تھی۔

جب کہ یاسمین کی آنکھوں میں صرف اور صرف نفرت تھی۔

البرٹ کو تاسف نے گھیر لیا۔ شہد رنگ آنکھوں میں کرب اترنے لگا۔

وہ اسے نفرت سے کیوں دیکھ رہی تھی؟ کیا واقعی اسے اس جھوٹ پر یقین آگیا تھا؟ اس کے دل پر خنجر سے چلے۔

بس ایک الزام کافی تھا اس کے پورے کردار کو خراب کرنے کے لیے؟ اس کی ساکھ برباد کرنے کے لیے؟

بس ایک جملہ کافی تھا یاسمین کو سب کچھ بھلانے کے لیے؟

اس کی نظریں اسے اذیت دے رہی تھیں۔ اسے چوٹ لگی تھی۔ پچھلی ہر چوٹ سے سب سے گہری چوٹ!

یاسمین کی آنکھوں میں غیظ و غضب ابھرا۔ سب درست کہتے تھے۔ یہ برٹش قابلِ بھروسہ نہیں تھے۔

البرٹ گردن نفی میں ہلانے لگا جیسے کہنا چاہ رہا کہ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ لیکن یاسمین کی آنکھیں اب بھی اسے ملامت کر رہی تھیں۔

وہ لاجواب ہی تو رہ گیا تھا۔ یاسمین کی وہ نگاہیں اس کا دل چھلنی کر رہی تھیں۔ اس کی روح کو گھائل کر رہی تھیں۔ وہ اسے کیسے بتائے کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ لیکن کیا یاسمین اسے جانتی نہیں تھی جو اتنی جلدی اس کو اپنا دشمن تصور کر بیٹھی؟

شاید جیمس نے ٹھیک ہی کہا تھا، یہ لوگ اپنی ہر آفت کا الزام دوسروں کو ٹھہرانے کے عادی ہیں۔

"سب جھوٹ ہے۔" اس نے آخری کوشش کرنا چاہی۔ ایسے جیسے ہوا میں تیر چلایا ہو، جو کہ وہ جانتا تھا کہ نشانے پر نہیں لگنا۔

"ہم پر ایک آخری احسان کرنا، البرٹ۔"

انداز میں اپنے لیے اجنبیت سن کر البرٹ کا دل روند گیا۔

"ہمارے بٹوے سے گھر کی چابی نکال لو، اور ہماری الماری میں موجود صندوق ہم تک پہنچا دو۔" اس نے اپنا منہ

پھیر لیا، جیسے اس سے گھن کھا رہی ہو، اس کی ذات سے گھن، اس کی شخصیت سے گھن۔

آنکھوں میں کاٹ لیے، وہ اسے دیکھتا گیا۔ ولیم اب یاسمین کو دور لے کر جا رہا تھا۔ وہ اب گاڑی میں براجمان تھی۔ اور گاڑی دور، سڑک پر بھاگنے لگی۔

روح قبض ہونے سے پہلے اس نے روح قبض ہونے کی تکلیف محسوس کی۔ وہ فانی ہو جانا چاہتا تھا۔ اسی لمحے، اس دنیا کو چھوڑ کر کہیں دور چلا جانا چاہتا تھا۔ شاید اس درد سے چھٹکارا پانے کا یہی ایک طریقہ تھا؟

اسی وقت جیمس نے البرٹ کے کندھے پر ہاتھ جمایا۔

البرٹ نے مڑ کر، اسے نم آنکھوں سے دیکھا۔ جیمس کو دیکھ کر اس کا سر ساتوے آسمان سے ٹکرایا۔ اس نے جیمس کو گریبان سے پکڑا اور دیوار سے لگایا۔ اسی وقت آس پاس پولیس والوں نے گن البرٹ کی جانب تان لی۔ جیمس کھسیانا سا ہو کر ہنسنے لگا پھر اپنے ساتھیوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"نیچے کر لو گنز۔ ہمارا ہی بھائی ہے یہ۔ شاباش۔" وہ پر سکون ہو کر بولا۔ چہرے پر کمینی مسکراہٹ تھی۔

پولیس والوں نے جھجک کر گنز نیچے کیں۔

"کیوں کیا میرے ساتھ ایسا؟ کیوں اس کی نظروں میں مجھے گرایا؟" وہ دانت پیستے بولا۔

"تم اب تک نہیں سمجھے۔" اس کے برعکس، جیمس پر سکون تھا۔ "میں نے تو تمھاری مدد کی ہے، البرٹ۔ میں تمھاری یہ غفلت دور کر دینا چاہتا تھا۔ آخر وہ اتنی جلدی کیوں مان گئی کہ تم نے ہی بات باہر کی ہے؟ کبھی سوچا؟ کیونکہ اس نے کبھی تمھارے اوپر دل سے بھروسہ کیا ہی نہیں تھا۔ میں تمھارا دشمن نہیں، دوست ہوں۔ میں نے تمھیں ایک بڑی غلطی کرنے سے بچا لیا ہے۔" جیمس آخر میں مسکرایا۔

البرٹ نے اس کا گریبان چھوڑا۔ وہ ایک بار پھر سے شل ہو گیا تھا۔ آس پاس ہوا اسے بھاری محسوس ہونے لگی تھی۔ جیمس ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کیا اتنے دن اسے دیکھنے کے بعد اس کے ارادوں پر شک کرنے کی گنجائش بنتی بھی تھی؟

اس کا دل کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ اس نے واقعی ایک ہندوستانی میں ایک دوست تلاش کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ اور اس غلطی کا نتیجہ وہ تکلیف تھی جس سے وہ اس وقت گزر رہا تھا۔ اس کا دل جیسے کچل دیا گیا تھا۔

انگیزشِ عدل

اس تکلیف کے ساتھ زندگی کو آگے کیسے بڑھایا جاتا؟

البرٹ ونسٹن جانتا نہ تھا۔ زندگی ایک بوجھ کے سوا کچھ نہ رہی تھی۔

......☆☆☆......

وہ اس سنسان گلی میں چل رہا تھا۔

یا یوں کہا جائے کہ وہ اپنا وجود اس گلی میں گھسیٹ رہا تھا۔

لڑکھڑاہٹ زدہ چال، بھیگی ہوئی پلکیں اور شل کندھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ وہاں کیوں آگیا تھا۔ شاید واقعی وہ اس پر ایک آخری احسان کر دینا چاہتا تھا۔

گھر کے عین سامنے وہ رک گیا۔ اس چھوٹی سی کیاری نے اس کی نظریں اپنی طرف مرتکب کیں۔

جس کیاری میں کبھی صرف یاسمین کے پھول ہوتے تھے' آج وہاں اس کے دیے گلاب بھی لگے ہوئے تھے۔

وہ اداس سا مسکرایا۔

پھر کرب سے مسکرایا۔

اور پھر نہ مسکرایا۔

سر جھٹک کر وہ چلنے لگا۔ اس گھر کی پر فسوں فضا میں داخل ہوا۔ اسے لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کے دل میں متعدد کانٹے پیوست ہوئے تھے۔ آج اس گھر کی دیواریں بھی ماتم کر رہی تھیں۔ ان کی غائبانہ سسکیاں وہ سن پا رہا تھا۔

کمرے کی کربناک فضا میں داخل ہو کر اس نے وہ الماری کھولی۔ سرد خاموشی چاروں اور پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے جھک کر تانبے کا صندوق باہر نکالا۔

لمحے بیتے۔ لالٹین میں بھڑکتے شعلے کی ہوا کے جھونکوں سے جنگ جاری تھی۔

اس زرد روشنی میں وہ اس صندوق کو گھورے جا رہا تھا۔ دل میں کہیں اسے کھولنے کی خواہش جگمگائی۔ مگر کیسے؟ اخلاقیت کو یہ عمل برا لگا۔ بالآخر اس نے اخلاقیت کی فصیل کو توڑ کر وہ صندوق کھول لیا۔

اندر خط ہی خط تھے۔

شہد رنگ آنکھوں میں ستائش ابھری۔ کاغذ کی مہک اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ کچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر وہ ان خطوط کو دیکھتا گیا۔ ان سے اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔ ان سے انسیت محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے جیسے وہ خطوط روح رکھتے تھے۔ وہ زندہ تھے۔ وہ اسے للچا رہے تھے۔ وہ اسے راز افشاں کرنے کی دعوت دے رہے تھے۔

اس نے ایک خط کو ہاتھوں میں لیا۔ لب ہل رہے تھے۔ وہ اس پر لکھے الفاظ پڑھ رہا تھا۔

پہلی سطر پڑھی۔

آنکھوں کی گہرائیوں سے آنسو ٹوٹ گیا۔ دل پر لرزاں طاری ہوئی۔ آنکھوں کے سامنے کئی رنگین منظر چل پڑے تھے۔ بیشتر قہقہے کانوں سے ٹکرائے۔

وہ صرف خط نہیں تھے۔ وہ کسی کو پوری دنیا تھے!

کسی کی پوری دنیا، جسے اجاڑا گیا تھا۔ کسی کی رنگین دنیا، جسے خون میں رنگ دیا گیا تھا۔

اس نے دوسری اور تیسری سطر پڑھی۔

دل یاس کا شکار ہوا۔ وہ صرف الفاظ نہ رہے تھے، وہ بھاری بھر کم اینٹ بن چکے تھے، ایسی اینٹیں جن کی سطح پر کانٹے ہی کانٹے تھے۔ وہ دل پر ٹھا کر کے لگے۔

دل دھاڑیں مار مار کر رویا۔ دل چلایا۔ دل نے سوگ منایا۔ دل نے ماتم کیا۔

اور اب چوتھی سطر پڑھ لی۔

اندر طوفان برپہ ہو گیا۔ روح کا عالم اس جنگل سا تھا، جس پر بجلی کی گرج چمک ہو جائے۔ ایک آگ سی اس پر لگ جائے اور پورے جنگل کو اپنے لپیٹ میں لے لے۔ وہ بھی جل رہا تھا۔ بری طرح سے۔ اس کا انگ انگ راکھ ہو رہا تھا۔ وہ راکھ کا ڈھیر بن رہا تھا۔ وہ ملیامیٹ ہو رہا تھا۔

اور جوں وہ خط مکمل ہوا، البرٹ کی سانسیں پھول گئیں۔ جیسے وہ کوئی جنگ لڑ گیا ہو۔ اسے لگا، جیسے اس کے کندھے پہاڑوں کے بوجھ تلے کچل دیے گئے ہوں۔

انگیزشِ عدل

ہاتھ کپکپا رہے تھے۔۔۔

دل بے اختیار تھا۔۔۔

مگر پھر بھی، وہ خود کو مزید خطوط پڑھنے سے نہ روک پایا۔ وہ ایسی راہ پر چل رہا تھا جس پر ہر طرف کانٹے ہی کانٹے تھے۔ آگے جاتا یا پیچھے، تکلیف مقدر بن چکی تھی۔ چبھن اٹل اور یقینی تھی۔

اس نے دوسرا خط پڑھا۔ تیسرا خط پڑھا۔ اور پھر سارے خط پڑھ ڈالے۔ وہ اتنا رویا اتنا رویا کہ اسے لگا وہ اندھا ہی ہو جائے گا۔ اسے لگا کہ وہ مر ہی جائے گا۔

اب کی بار جو کرب اس کے دل کو گھیرے ہوئے تھا وہ جان لیوا ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے اندر سے جینے کی خواہش مسخ کر رہا تھا۔ اس کی شہد رنگ آنکھوں کی رونق کا قتل کر چکا تھا۔

اس نے صندوق بند کیا تو جیسے وہ کسی وقت کے دروازے کو بند کر کے، حال میں لوٹ آیا۔

گرم گرم آنسو اس کی آنکھ کی سمت سے ابلتے اس صندوق کی سطح کو بھگو رہے تھے۔ وہ سسکیاں لے لے کر روتا گیا۔ اشک برساتا گیا۔ مگر یہ آگ تھی کہ بجھنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔

وہ اپنے لیے نہیں رو رہا تھا۔ ان خطوط کو پڑھ کر تو وہ اپنی تکلیف بھلا بیٹھا تھا۔ وہ خطوط جس تکلیف کا تذکرہ کر رہے تھے، اس تکلیف کے سامنے اس کا کرب تو جیسے وجود ہی نہیں رکھتا تھا۔

وہ یاسمین کے لیے رو رہا تھا۔ وہ صرف خط نہیں تھے۔

وہ یاسمین کی سوانح حیات تھے۔ وہ اس کے ماضی کی کربناک داستان اپنے اندر سمائے ہوئے تھے۔ آج پہلی مرتبہ اس نے یاسمین کو پہچانا تھا۔

آج البرٹ کو معلوم ہوا تھا کہ، سیدہ یاسمین مجاہد آخر کیا تھی۔

وہ درست تھا، یاسمین کی آنکھوں میں اترنا کسی کانٹے دار کھائی میں اترنے سے کم نہ تھا۔

آج وہ اترا تھا۔

گہرائی میں۔۔۔ اندھیرے میں۔۔۔

چبھن ہوئی تھی۔ لہو بھی نکلا تھا۔ پرانے زخم کریدے تھے۔ نئے زخم بھی ملے تھے۔
مگر اتنی تکلیف کیوں ہو رہی تھی؟

......☆☆☆......

تھانے میں صندوق چھوڑ کر وہ سرائے واپس پہنچا۔

شہد رنگ آنکھیں سُرخی مائل ہو رہی تھیں، اور وجود وزنی محسوس ہو رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بستر پر بیٹھ گیا اور گردن موڑ کر کھڑکی سے نظر آتے ہلال کو تکنے لگا۔ شہد رنگ آنکھوں میں چاند کا خوبصورت عکس انعکاس ہو رہا تھا، مگر وہ خود غمگین تھیں۔ آسمان میں کھلی اس چاندنی کے باوجود یہ رات اسے غیر معمولی طور پر تاریک معلوم ہو رہی تھی۔

وہ جو خود تاریکیوں میں چلا گیا تھا، شاید اس لیے۔

اس کے کندھے شل ہوئے اور وہ بستر پر لیٹ گیا۔ دل میں سوزش بڑھنے لگی، اور آنسو بہنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ بہت رویا۔ کتنا وقت بیتا، اسے اندازہ نہ ہوا۔

قیام کے آخری ایام میں ہندوستان اسے بدل رہا تھا۔ شاید پہلی مرتبہ البرٹ نے ہندوستان کو دیکھا تھا۔ نگاہوں سے چمک دمک کی پٹی اتر گئی تھی اور اب وہ ہندوستان کا اصل دیکھ رہا تھا۔

وہ ہندوستان جو برباد ہو رہا تھا۔

جس کی مٹی میں تازے خون کی ملاوٹ تھی۔ وہ ہندوستان جو دھاڑے مار مار کر رو رہا تھا۔ دنیا کو اپنی تکلیف باور کروانا چاہ رہا تھا۔ وہ ہندوستان جو قید تھا۔

آج سب نظر آرہا تھا۔ سب کچھ۔ سب کچھ نظر آنا ہمیشہ خوش گوار نہیں ہوتا۔ بعض حقائق عیاں ہونے پر جسم پر زہریلے نشتر گھونپ جاتے ہیں۔

وہ اٹھ کر بیٹھا۔ چہرے پر آنسو جمے ہوئے تھے، چہرے کی کھال انتہائی خشک محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اسے پرواہ نہ رہی تھی۔

چاندنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ سوکھ چکا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور خود کو کھڑا کیا۔

میز پر کاغذ پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا وفادار قلم بھی، کاغذ پر روانی سے چلنے کے لیے تیار تھا۔

اور البرٹ۔۔۔

وہ بھی لکھنے کے لیے تیار تھا۔

......☆☆☆......

وہ اس کال کوٹھری میں قید تھی۔ وہ پتھریلے فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ اس سنسان فضا کی مانند، اس کا چہرہ بھی پر سکوت و ویران تھا۔ بال جو اکثر جوڑے میں بندھے ہوتے تھے، اب کہ چوٹی میں بندھے ہوئے تھے اور اس کے کمر پر جھول رہے تھے۔

اس کے سامنے تانبے کا وہ صندوق تھا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائی۔

آنکھیں بے ساختہ نم ہوئیں۔ اس نے محبت سے اس صندوق پر ہاتھ پھیرا اور اس پر بنے نقش کو پوروں سے محسوس کیا۔ سیاہ آنکھوں میں کرب کے سائے میں شناسائی ابھری۔ اس نے صندوق کھولا تو وہ خطوط نمایاں ہوئے۔

گندمی ہاتھ کپکپاہٹ کے ساتھ اس صندوق میں داخل ہوئے۔ بالآخر اس نے ایک خط نکالا۔ وہ ان خطوط کو پچھلے سالوں میں اتنی مرتبہ پڑھ چکی تھی کہ ہر کاغذ کے رنگ سے ہی جان جاتی تھی کہ اس میں کیا لکھا تھا۔

خط میں لکھا پیغام، اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ اسے بے آواز پڑھ رہی تھی۔

مگر پھر بھی، اسے کسی کی آواز آرہی تھی۔ کسی کی گھمبیر پر کشش مردانہ آواز۔ وہ آواز جو کسی زمانے میں اسے دنیا کی سب سے خوبصورت آواز لگتی تھی۔ وہ آواز جو زندگی کی ساری تلخیاں پی جاتی تھیں۔

"میری یاسمین۔

مجھے آخر کار بختیار چچا نے مسجد میں پہچان لیا۔ میں ان کی نظروں میں آنے کے لیے ان کے برابر والی صف پر نماز پڑھتا تھا۔ اور آج اتنی جحتوں کے بعد' انھوں نے مجھ سے بات کی۔

انگیزشِ عدل

پچھلے کئی دنوں سے وہ مجھے دیکھتے تھے تو مجھے ان کی آنکھوں میں چمک نظر آتی تھی۔ اب پتہ نہیں یہ سب سراب تھا یا واقعی وہ مجھے اچھا سمجھتے ہیں۔

میں بس ایسے ہی کوشش کرتا رہوں گا۔ اور جب مجھے لگے گا کہ میں ان کے دل میں گھر کر چکا ہوں تو تمھارے لیے رشتہ بھی بھیجوں گا۔ ہماری محبت کی کہانی بہت جلد اپنے خوش بخت اختتام کو پہنچے گی، یاسمین۔

ہمیشہ معطر رہنا۔

تمھارا اپنا،

جمال الدین۔"

لبوں پر آسودہ مسکراہٹ سجائے، اس نے خط کو اپنے سینے سے لگایا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

ان خط میں اب تک جمال کی خوشبو رقم تھی۔

اس نے آنکھیں بند کیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جمال اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ اس پر فخر کر رہا تھا۔

......☆☆☆......

وہ کاغذ کے صفحے پر اپنا قلم چلا رہا تھا۔

"یہ چند صفحات لکھنا میرے لیے نہایت مشکل ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ان صفحات کو سیاہی سے بھرنے کے لیے مجھ سے یہ کتاب لکھوائی گئی ہے۔

یہ صفحات ان ہندوستانیوں کے نام ہیں، جو آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ جن کو دنیا جنگلی، وحشی اور بیوقوف سمجھتی ہے۔ جن کو دنیا ایسے تصور کرتی ہے جیسے وہ ایک جانور ہوں جو بلاضرورت اپنے آپ کو تکلیف پہنچا رہا ہو۔

کچھ دنوں پہلے تک میں بھی یہی گمان کرتا تھا۔

پھر کسی نے مجھ سے پوچھا کہ: "میں اس دیس میں کتنے سالوں سے رہ رہا ہوں؟"

اور بس۔ مجھے میرا جواب مل گیا۔ دنیا کے کسی کونے میں بیٹھ کر ان پر تنقید کرنا، طنز کسنا آسان ہے۔ کیونکہ نہ ہم نے ان جیسی زندگی جی ہے اور نہ ہی ان کی کہانی سے واقف ہیں۔

لیکن اب میں ان لوگوں کی کہانی جان گیا ہوں۔ میں جان گیا ہوں کہ یہ لوگ شدت پسند کیوں بن گئے ہیں۔ اب میں سب جان گیا ہوں۔

کہتے ہیں آگہی نعمت ہے۔ واقعی ایک نعمت ہی تو ہے۔ کیونکہ آگہی غلط فہمی کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ لیکن آگہی تکلیف دہ بھی ہوتی ہے۔

کچھ سچ اس قدر تکلیف دہ ہوتے ہیں کہ وہ آپ کو ساری زندگی ڈراتے ہیں۔ میرا ابھی اس وقت کچھ ایسا ہی عالم ہے۔"

......☆☆☆......

کپکپاتے ہاتھ اور لرزتے لبوں کے ساتھ اس نے وہ خط واپس اس صندوق میں رکھا۔

اس نے دوسرا خط نکالا اور کچھ دیر اسے اپنائیت سے دیکھا۔

پھر اسے کھول کر اس پر لکھا پیغام پڑھا۔ ایک دفعہ پھر سے، جمال کی گہری دلکش آواز اس کے کانوں میں داخل ہوئی۔

"میری یاسمین۔

امید کرتا ہوں چھمی نے یاسمین کے بیجوں کے ساتھ، یہ خط بھی دے دیا ہوگا۔ اب ان یاسمین کے بیجوں کو اپنی کیاری میں لازماً لگانا۔ پتہ ہے مجھے کسی نے کہا تھا کہ یہ پھول بلا کے معطر ہوتے ہیں۔ اور پھر مجھے سمجھ آگیا کہ بختیار چچا نے تمھارا نام یاسمین کیوں رکھا۔

تو تم ان بیجوں کو اپنی کیاری میں لگانا۔ اس کیاری میں یاسمین کے پھولوں کا ایک چھوٹا سا چمن بنانا۔ انھیں دیکھ کر مجھے یاد کرنا۔ یہ میرا پہلا تحفہ ہے تمھاری لیے۔ ہماری محبت کی پہلی نشانی۔ وہ کیاری مانو کہ تمھارا دل ہے، اور ان میں لگے یاسمین، میری محبت کی نشانی۔ اس کیاری کو ان پھولوں سے بھر دینا۔

اب اپنی معطر یاسمین کو ایک اور خوش خبری سناؤں؟ میں نے گھر میں بات کرلی ہے۔ اور ماں جان تیار ہیں جانے کے لیے۔ انھوں نے ایک خدشہ ظاہر کیا کہ تم لوگوں کی اتنی زمینیں ہیں۔ تمھاری دادی کی مشہور بیکری چمنِ

گلاب بھی ہے۔ اور میں معمولی سا ایک سپاہی۔ لیکن چچا مجھے مادہ پرست نہیں لگے اس لیے دل مطمئن ہے۔

پھر بس۔ وہ دن بھی بہت قریب ہے جب تم میرے گھر میں، میرے کمرے میں میری بیوی بن کر آؤ گی۔ اور اب یہ راتیں میں اسی دن کے انتظار میں کاٹ دوں گا۔

اپنا خیال رکھنا یاسمین۔

وہ جو صرف اور صرف تمہارا ہے۔

جمال الدین"

......☆☆☆......

"میں آپ کو ایک لڑکی کی حقیقی کہانی سناتا ہوں۔

وہ جو شوخ و چنچل، خوش اخلاق تھی۔ اپنی دنیا میں مست، رنگوں میں رنگی ہوئی ایک انساں تھی۔

اسے محبت ہوئی۔ اس محبت کو اس نے حاصل بھی کر لیا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی محبت کا مل جانا اس کا خوش بخت انجام ہے۔ لیکن نہیں۔ اس محبت نے اس کی سب سے بڑی آزمائش بن جانا تھا۔ اس محبت نے اس سے ایسا کڑا امتحان لینا تھا، کہ اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل جانا تھا۔

آخر ایسا کیا ہوا؟ میں بتاتا ہوں۔"

......☆☆☆......

وہ اب تیسرا خط اٹھا رہی تھی۔ اس خط کی سطح پر ہاتھ رکھتے ہی اس کا دل بھر گیا تھا اور وہ رونے لگی تھی۔ اس خط پر لکھے الفاظ بہت بھاری تھے۔ کیونکہ وہ جمال کے ہاتھ سے لکھے گئے آخری الفاظ تھے۔

محبوب کے آخری الفاظ، بھلا کتنے خوشگوار کیوں نہ ہوں، ساری عمر کا روگ بن جاتے ہیں۔

اس نے جیسے ہی اس خط کو اٹھایا اس کا دماغ اس کال کوٹھری سے پرواز کرنے لگا۔ وہ ماضی کے مناظر میں جانے لگی تھی۔

سامنے سے وہ دیواریں سرکیں۔

فرش ناپید ہوا۔

اور اس نے خود کو ایک گھر کے دروازے پر پایا۔

وہ چھ سال پہلے کا منظر تھا۔

وہ گرمی کا ایک حبس آلود دن تھا۔ پیشانیوں اور گردنوں پر پسینے جھلک رہے تھے۔

اس کے سامنے وہ مرد کھڑا تھا۔ وہ مرد، جو کسی زمانے میں اسے دنیا کا سب سے حسین مرد لگتا تھا۔ وہ مرد جسے وہ اپنی کل متاع کا درجہ دیتی تھی۔ وہ خوبرو سا مرد جو اس کے سامنے اپنا یونی فارم زیب تن کیے ہوئے کھڑا تھا۔ وہ مرد جس سے جدائی کے خیال نے اسے بے طرح توڑ دیا تھا۔ مگر وہ اسے دیکھ نہیں رہی تھی۔ جانتی تھی کہ اسے دیکھا تو بری طرح سے ڈھے جائے گی۔

”نہ جائیں جمال۔“ اس کا دل ہچکولے مار رہا تھا۔

اس نے نظر اٹھا کر، اپنے مقابل کھڑے اس مرد کو دیکھا۔ اس کی بھوری آنکھیں شجاعت سے بھرپور تھیں۔ اسے دیکھتے ہی سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اندازے کے عین مطابق، وہ ڈھے جانے کو تھی۔ وہ خود کو کھو دینے کو تھی۔

جمال نے اسے محبت سے دیکھا۔ اپنے بھاری ہاتھوں سے اس کے گندمی چہرے پر پھیلی نمی رگڑی۔ وہ اپنی جگہ کھڑی رہی، ساکن ہو کر اس کے لمس کو محسوس کرنے لگی۔ جمال نے اپنے ہاتھوں کا پیالہ بناتے اس کے چہرے کو ٹھوڑی کی سمت سے نرمی سے تھاما۔ مشفق نگاہیں اس کی سیاہ آنکھوں میں گاڑھیں۔

”ایسے نہ رو۔ میں جلد واپس آؤں گا۔ انھوں نے کہا تھا کہ اگر ہم اس جنگ میں حصہ لیں گے تو خلیفہ اور خلافت کو کچھ نہیں ہو گا۔ یہ قربانی تو دینی ہی ہو گی۔“ وہ عقیدت سے بولا۔

وہ گردن دائیں بائیں ہلانے لگی۔ دل کسی صورت مطمئن نہ ہو رہا تھا، وہ انہونی کو بھانپ چکا تھا۔ جمال کے ہاتھ پھر سے نیچے ہوئے۔

”مگر ہمارا دل ڈوب رہا ہے۔“ اس کی گردن بے ساختہ، جھک گئی۔

جمال نے ایک مرتبہ پھر اس کے گالوں کو تھاما اور اس کا چہرا سیدھا کیا۔

اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑھ کر بات جاری رکھی۔

”کبھی اپنی گردن جھکنے نہ دینا، یاسمین۔“

اس کے کہنے کی دیر تھی کہ یاسمین اس کے سینے سے لگ گئی۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔ نہ جانے ایسی کتنی راتیں آنے والی تھیں، جب اس کا یوں ہی رونے کا جی چاہے گا، مگر سر رکھنے کو یہ سینا، اور یہ کشادہ کندھے ملنے والے نہ تھے۔

”بس اپنا خیال رکھنا اور دعاؤں میں یاد رکھنا۔“

جسم نے ایک جھٹکا کھایا۔ ماضی کی یاد کہر آلود ہوئی۔ جوں ہی وہ جیل میں لوٹ آئی۔

اس نے تکلیف دہ سسک لی جیسے وجود پر ایک خنجر پیوست ہوا ہو۔

آنسو اب تسلسل کے ساتھ روانہ ہو گئے تھے۔

وہ اس دن سنگاپور کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اور پھر کبھی نہ آیا۔

کبھی نہیں!

......☆☆☆......

”جب انیس سو چودہ میں عظیم جنگ کا آغاز ہوا اور برطانیہ نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو ہندوستان کے مسلمان نے کافی خدشات ظاہر کیے۔ مسلم سیپائیز نے عظیم جنگ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ سلطنت عثمانیہ جرمنی کے ساتھ تھی۔

برٹش نے سیپائیز کو یقین دہانی کروائی کہ اگر وہ لوگ ان کی مدد کریں گے تو سلطنتِ عثمانیہ کو توڑا نہیں جائے گا۔

بہت سے مسلم سیپائیز صرف اس باعث جنگ میں شریک ہوئے۔

اس لڑکی کا شوہر بھی ایک سیپائی تھا۔ وہ بھی یہی سوچ کر اس جنگ میں گیا تھا کہ ایسا کرتے ہوئے وہ سلطنتِ عثمانہ کو بچائے گا۔

لیکن سب کچھ دھرا کا دھرارہ گیا جب میرے اپنے ملک کے حکمرانوں نے، ان کے ارمانوں کا خون کیا۔ انھیں ترکی میں لڑنے پر مجبور کیا۔ اس صورت میں جن سیپائیز نے لڑنے سے انکار کیا، انھیں بے دردی سے مارا گیا اور کچھ کو قید کر لیا گیا۔

قصور وار کون ہے؟ زخم کس نے کس کو دیا ہے؟ ظالم کون ہے اور مظلوم کون ہے؟

کیوں ہندوستانیوں کے جذبات کا اس طرح مذاق بنایا گیا تھا؟

اس لڑکی کا کیا قصور تھا کہ اس کی محبت ایک جھٹکے میں چھین لی گئی؟ کیوں اس کے رنگین خوابوں کو توڑا گیا؟

اور آج اگر وہ لڑکی اپنے حق کے لیے آواز اٹھانا چاہ رہی ہے تو کیوں اس کی آواز کو دبایا جارہا ہے؟

ہندوستانی واقعی قید ہیں۔ انھیں نہ بولنے کی آزادی ہے نہ ہی اپنا حق مانگنے کی آزادی ہے۔"

......☆☆☆......

اس نے وہ خط کھولا۔ بوجھل دل کے ساتھ اسے پڑھنا شروع کیا۔ وہ آواز پھر سے سنائی دے رہی تھی۔ مگر اس میں تازگی نہیں تھی۔ اس میں خالی پن اترا ہوا تھا۔ اس میں بے کسی سی بے کسی تھی۔ رنج سا رنج تھا، اور انتہاء کی تڑپ۔

"میری یاسمین۔

میں جانتا ہوں یہ خط دیکھتے ہی تمھاری آنکھیں بھر گئی ہوں گی۔ میں جانتا ہوں تم رو رہی ہو گی۔ تکلیف میں ہو گی کرب میں ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ خط لکھنے سے کترا رہا تھا۔ لیکن پھر تمھارا خیال آگیا تو بہت مشکلوں سے یہ خط تمھیں بھیجنے کی سعی کی۔

یاسمین۔ یہاں حالات بگڑ گئے ہیں۔ افوائیں پھیل گئی ہیں کہ سنگاپور بلا کر وہ ہمیں ہانگ کانگ نہیں ترکی بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دعا کرو ایسا نہ ہو۔ بس دعا کرو۔ کیونکہ ہم کبھی بھی اپنے ترک بھائیوں سے نہیں لڑ سکتے۔ اگر یہ افوائیں سچ ہو جاتی ہیں یاسمین، تو بدقسمتی کے ساتھ ہمیں ان کے احکام ماننے سے انکار کرنا ہو گا۔

میں نہیں جانتا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ لیکن یاسمین۔ یہ میری آزمائش ہے۔ میں چاہوں تو ان کی رضامندی میں راضی ہو کر ترکی چلا جاؤں۔ لیکن پھر اپنے اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ کیا جواب دوں گا؟

انگیزشِ عدل

یاسمین۔ تم اپنے آپ کو مضبوط کرلو۔ یہ میری آزمائش ہے اور میری اس آزمائش کے اختتام پر تمھاری آزمائش شروع ہوگی۔ تم نے ہر چیز کے لیے تیار رہنا ہے۔ ہم ان برٹش پر بھروسہ نہیں کرسکتے۔ یہ ہمارے اوپر ہر صورت وار کریں گے۔ یہ ہمارے درمیان ایک زہر کی مانند ہیں۔ ایک سانپ کی طرح ہمارے دیس پر بیٹھے ہیں، یاسمین۔ میں رہوں نہ رہوں، اس سے فرق نہیں پڑتا، لیکن تم نے بھی وہی کرنا ہے جو میں کروں گا۔

وہ ہے جنگ۔ ہمیں اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کرنی ہوگی۔ ہم ان لوگوں کو ہمارے اوپر مزید مظالم ڈھانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔

اور خدارہ رونامت۔ تمھاری بھیگی آنکھوں اور غمگین چہرے کو تصور کرتا ہوں دل کرب سے جھلس جاتا ہے۔ بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اذیت ہوتی ہے۔ میں تھکنے لگتا ہوں، ہمت ہارنے لگتا ہوں۔ بس کچھ بھی ہوجائے، رونامت۔

میرے دور ہونے سے ہماری محبت میں فرق تھوڑی پڑے گا؟ تمھیں میں جب بھی یاد آؤں تو ہمارے اس چھوٹے سے یاسمین کے چمن کو دیکھ لینا۔ میرے پہلے تحفے کو یاد کرنا اور بس مجھے دعا دینا۔

وہ پھول تمھیں یاد دلائیں گے کہ تمھیں معطر رہنا ہے۔

اپنی زندگی کو بامقصد بنانا ہے۔

اپنا خیال رکھنا۔

پھر ملیں گے،

فقط ایک دوسرے جہاں میں۔"

......☆☆☆......

"آج وہ لڑکی بدل گئی ہے۔ تہس نہس ہوگئی ہے۔

جو کبھی ہنستی تھی وہ اب ہنستی نہیں۔

جو کبھی مسکراتی تھی وہ مسکراتی نہیں۔

کون ہے اس کا مجرم؟

انگیزشِ عدل

اور یہی تو کہانی ہر دوسرے ہندوستانی کی ہے۔ وہ بہت کچھ گنوا بیٹھے ہیں۔ عزتیں لٹا چکے ہیں۔ مال و دولت قربان کر چکے ہیں۔ اپنے جذبات اور احساسات کی بے عزتی اور ناقدری سہہ چکے ہیں۔

انھیں حق ہے اپنی آزادی کے لیے لڑنے کا۔

میں البرٹ ونسٹن، برطانیہ کا ایک شہری ہوں۔

اور میں ان ہندوستانیوں کے ساتھ ہوں۔

میں دعا گو ہوں کہ ایک دن ایسا بھی ضرور آئے۔ جب یہ لوگ آزادی دیکھیں۔

جب یہ لوگ حقیقت میں آزاد ہوں۔

میں چاہتا ہوں کہ ایک دن ان کی یہ کوششیں رنگ لائیں، اور رنگوں کا یہ دیس ایک بار پھر رنگین ہو جائے۔

میں البرٹ ونسٹن ہوں۔ اور میں ہر دلیر ہندوستانی کے ساتھ ہوں۔

ختم شد۔"

اس نے کاغذ سے قلم اٹھایا۔ اس کی سانس پھولنے لگی تھی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

اس نے قلم ڈھیلا چھوڑا اور اپنی گردن جھکالی۔ ایک گہری سانس اس کی ناک سے خارج ہوئی۔

اس نے اپنی گردن اٹھائی۔ ہلال کی چاندنی میں اس کا چہرہ نمایاں ہوا۔ سفید چہرہ سُرخی مائل تھا، اور آنکھیں دل میں بھڑکتے آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آچکی تھیں۔

جنگ کا وقت آپہنچا تھا۔ وہ تنہا تھا۔ اسے ہی لشکر جمع کرنے تھے۔ اسے ہی ان سب کی آواز بننا تھا۔ مگر وہ تیار تھا۔ ہر محاذ سے ٹکرانے کے لیے۔ اونچے سے اونچے پہاڑ کو سر کرنے کے لیے۔

البرٹ ونسٹن تیار تھا۔

......☆☆☆......

آفتاب کی پہلی کرن نے امر تسر کے سیاہ آسمان کو چیر دیا۔ شب خوابی سے باشندے بیدار ہونے لگے اور رفتہ رفتہ بازار آباد ہوئے۔ مگر آج امر تسر بے رونق تھا، یوں جیسے اس کے احاطوں پر رنجیدگی کا راج ہو۔

انگیزشِ عدل

وہ اس گلی میں چل رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے اور گالوں میں پڑتے گڑھے اس کے ناتواں ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ وہ رات کے لباس میں موجود تھا۔ گزشتہ رات اس نے صبح کے انتظار میں گزاری تھی۔ جب کوئی اپنا ظلم کا شکار ہو جائے تو نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔

قلتِ توانائی کے باعث، اس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور وہ نڈھال ہونے کو تھا۔ ایک ایک قدم اٹھانا اس پر دشوار تھا، مگر پھر بھی وہ ہمت کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر اس گلی میں اپنا راستہ بنا رہا تھا۔ البرٹ ونسٹن آج وفاداری کی قیمت چکا رہا تھا۔ محبت کی قیمت چکا رہا تھا۔ وہ کہاں جانتا تھا کہ محبت اور وفاداری کی قیمت چکانے کے لیے اپنی ذات کو کھو دینا پڑتا تھا؟

مگر وہ یاسمین کے لیے خود کو کھو دینے کے لیے بھی تیار تھا۔

وہ جو نہ جانے کیسے اس کی زندگی کا اتنا بڑا حصہ بن گئی تھی۔ اس سوال کے جواب کا تو وہ خود بھی متلاشی تھا۔

چمنِ گلاب کے عین سامنے اس کے قدم رک گئے۔ اس نے گردن اٹھا کر وہ تختی دیکھی جس پر چمنِ گلاب لکھا تھا۔ وہ مسکرایا، شہد رنگ آنکھوں کے پیچھے یادوں کی ٹرین چل پڑی۔ چمن گلاب، جہاں خوشیاں بانٹی جاتی تھیں۔ اس خوشیوں سے بھری چمنِ گلاب کو آج ویران دیکھ کر اسے دکھ ہوا۔

اس کی نظر اس تختی کے پیچھے پڑی۔ آج چمنِ گلاب کا دروازہ بند تھا۔ چہرے پر پھیلی موہوم مسکراہٹ کا خون ہوا۔ خوشگوار یادوں کی ٹرین پٹری سے پھسل گئی۔

وہ گلی کے بیچ میں کھڑے ہو کر اس دروازے کو ہنوز تکتا گیا۔ اس کے گرد و نواح میں لوگ چہل قدمی کر رہے تھے، سب کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں۔ وہ کون تھا، کس حال میں تھا، کسی کو غرض نہ تھا۔

کوئی اسے جانتا نہ تھا۔

مگر اب سب اسے جان جائیں گے۔

دفعتاً اس نے کندھے اٹھائے۔ ہاتھوں کی مٹھی بنائی اور بازو ہوا میں بلند کیے۔

”کوئی مجھے سن رہا ہے!“ وہ با آواز بلند بولا۔

یکبارگی، سکوت سا بازار میں پھیلتا گیا۔ قدموں کی چاپ رک گئی، چہ مگوئیاں معدوم ہوتی گئیں۔
سب اپنی مصروفیات کو پسِ پشت دھکیل کر اس نقاہت ذدہ مرد کی جانب متوجہ تھے۔

......☆☆☆......

وہ کال کوٹھری میں گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ اس کی پشت پر خواتین کا عملہ کھڑا تھا۔ سب کے چہروں پر اس لڑکی کے لیے شدید ناگواری تھی۔

ایک عورت نے کوڑا اس کی پشت پر برسایا۔ اس کے چہرے پر کرب جھلکا لیکن اس نے جسم کو حرکت کرنے سے باز رکھا۔ اس نے ہنوز اپنی گردن سیدھی رکھی۔

آنکھوں کی سرد مہری کو برقرار رکھتے بس ایک جملہ اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

"کبھی اپنی گردن جھکنے نہ دینا، یاسمین۔"

کون جانتا تھا کہ جمال کی آخری ہدایتوں پر عمل کرنے کے لیے، اسے اتنی شدید جدوجہد کرنی پڑ جائے گی؟

("تم لوگ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ کوئی سیدہ یاسمین مجاہد کے لیے کھڑا کیوں نہیں ہو رہا؟" وہ بچی کچی ساری قوت بولنے پر خرچ کر رہا تھا۔)

"کہاں ہیں تمھارے باقی ساتھی۔" کوڑا برساتی عورت چبا چبا کر بولی۔ اس کی آنکھوں میں جارحانہ تاثر تھا۔

وہ جواب دے سکتی تھی، اسی وقت اس تکلیف سے نجات پا سکتی تھی۔ اس کے پاس وہ راستہ موجود تھا۔ دل کا ایک حصہ، شاید یہ کرنا بھی چاہ رہا تھا۔ مگر وہ اپنے لوگوں کو دھوکہ نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے گردن کا تناؤ برقرار رکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔

جواب نہ آنے کی صورت میں عورت نے ایک اور کوڑا برسایا۔ اس کے حلق سے ایک سسکی نکلی۔ جسم میں تکلیف کی ایک لہر دوڑی۔

"ان کے نام بتاؤ۔"

وہ موت کو چن سکتی تھی، لیکن اپنے حریفوں کے سامنے جھک جانا اسے گوارا نہ تھا۔ اس فیصلے کے بدلے وہ نہ

جانے کتنے گھنٹوں تک اس جسمانی اذیت کو سہتی گئی۔

(”تم اس کی عظمت کی داستان بھول تو نہیں گئے؟ کیا تم لوگوں کو یاد نہیں، کہ کیسے وہ تمھارے بچوں کو بسکٹس اور کیک دیتی تھی۔ یہاں کے بیوہ اور یتیم بہنوں کو، جن کے سروں پر وارث نہیں، انھیں امداد فراہم کرتی تھی۔ کیسے وہ تمھاری آزادی کے لیے ہی آواز بلند کرتی تھی۔ کیا تم لوگ یاسمین کے لیے آواز بلند نہیں کروگے؟“ آواز میں بلند حوصلگی تھی۔ ایک تاثیر تھی اس کی آواز میں جس کے باعث بازار میں کھڑے ہر شخص کی گردن جھک گئی تھی۔)

عورتوں کا عملہ اب اس کی خاموشی سے اکتا چکا تھا۔ سب نے ہاری ہوئی نگاہوں کا تبادلہ کیا۔

کچھ ہی دیر میں کال کوٹھری میں جیمس داخل ہوا۔ بھوری آنکھوں میں فتح کا ازلی تاثر تھا۔ اس نے جتاتی نگاہ سے اس بلند حوصلہ لڑکی کو دیکھا۔

وہ اب بھی ٹھنڈی ٹھار نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”موت سر پر کھڑی ہے۔ مگر اکڑ نہیں گئی۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ بھوری آنکھوں میں حقارت تھی۔

”کھڑا کرواسے۔“ وہ دھاڑا۔

عورتوں نے اس کے بازوؤں کو سختی سے تھام کر اسے جبراً کھڑا کیا۔ جسم ڈگمگ ہوا۔ حلق سے سسکیاں جاری ہوئیں۔ مگر اس نے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو جھکنے نہ دیا۔

جیمس قدم قدم بڑھاتے اس کے عین سامنے جا پہنچا۔ بھوری آنکھوں میں جارحانہ تاثر سجا۔

”بتاؤ۔ کہاں ہیں تمھارے ساتھی؟“ وہ چبا چبا کر بولا۔

بدلے میں یاسمین کو چہرا ساکت رہا۔ وہ ہنوز اسے دیکھتی گئی۔

جیمس نے دانت پیستے ایک تھپڑ اس کے گال پر رسید دیا۔ چہرا چند ثانیے کے لیے ترچھا ہوا۔ جو اس نے خود ہی سیدھا کیا۔

”کیا مل رہا ہے خاموش رہ کر؟ جانتی ہو اس خاموشی کی سزا موت ہے۔ اگر نہ بولی تو کل تک تمھارا جسم گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔“ آواز پھر سے دھیمی کی۔ آنکھوں میں جوش تھا، جیسے یہ تصور ہی اسے محظوظ کر رہا ہو۔

وہ اسے طمانیت سے دیکھتے ہوئے، مسکرا دی۔ اب کی بار جیمس کی بھنویں سکڑ گئیں۔

”موت منظور ہے۔ دغا منظور نہیں۔“ وہ کمزور آواز میں چبا چبا کر بولی۔

جیمس نے ایک اور تھپڑ اس کے گال پر دے مارا۔ اس کا ماتھا پسینے میں نہا چکا تھا۔ اس نے یاسمین کے سُرخ گالوں کو اپنے ہاتھ میں دبوچا۔

”تمھیں تو میں بڑی خاص موت سے نوازوں گا، یاسمین مجاہد۔ کہا تھا نا، جیمس جس کے پیچھے پڑ جائے اسے بخشتا نہیں ہے۔“ چبا چبا کر کہتے اس نے اس کا چہرہ آزاد کیا۔

”چھوڑو اسے۔ اور چلو۔“ وہ دھاڑ کر، کمرے سے نکل گیا۔ خواتین بھی اپنا سامان سمیٹتے ہوئے جانے لگیں۔

ان کے جاتے ہی وہ ڈھیلی ہو کر فرش پر لیٹ گئی۔ سفید کرتے کی پشت، خون کی سُرخی میں رنگ چکی تھی، مگر اس نے چہرے پر ایک آنسو بھی پھوٹنے نہ دیا۔

اسے اپنے گھائل بدن کی پرواہ نہ تھی۔ اسے جسم سے رستے ہوئے خون کی پرواہ نہ تھی۔ اس موت کی پرواہ نہ تھی جس سے جیمس اسے ڈرا رہا تھا۔

کیونکہ وہ بے خوف تھی۔

(”وہ جو تم لوگوں کے لیے آواز بلند کرتی تھی، آج اس کا حق نہیں کہ اس کے لیے آواز بلند کی جائے؟ کیا ہم ایسے ہی خاموش رہ کر اسے قید میں مظالم سہنے کی اجازت دیتے رہیں گے۔ خدارا جاگ جاؤ۔ چھوڑو اپنی آرام گاہیں اور نکل آؤ۔ جاگ جاؤ!“)

امرتسر کے گلی کوچوں میں رش بھر گیا تھا۔

”یاسمین کو آزاد کرو“ یہ نعرہ وہ سب بلند کر رہے تھے۔

اس احتجاج میں نہ صرف مرد شامل تھے، بلکہ عورتیں بھی شامل تھیں۔ وہ سب بھی شامل تھے جنھیں وہ اپنی بہن کہتی تھی۔ وہ بچے بھی شامل تھے جن کے سروں پر وہ شفقت سے ہاتھ پھیرتی تھی۔

امرتسر میں ایک طوفان برپا ہو چکا تھا۔

انگیزشِ عدل

("جاگ جاؤ۔ اسے ضرورت ہے ہماری!" وہ کہہ کر گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا۔ اشک اس کی شہد رنگ آنکھ سے ٹوٹ گیا۔

جوں اسے محسوس ہوا کہ کسی نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

"چلو!" ایک مرد نے اونچی آواز میں کہا۔

اس نے ادھر ادھر گردن دوڑائی۔ سب لوگ تیار تھے۔ سب کے چہرے اولوالعزم تھے۔ وہ سب بھی بے خوف ہو گئے تھے۔ جب کھونے کو کوئی شے نہ ہو تو انسان بے خوف ہو جاتا ہے۔)

امرتسر کے بازار خالی ہونے لگے۔ یہاں تک ہندو کالونی سے بھی بچے عورتیں اور مرد یاسمین کے لیے نکلے تھے۔ سب مذہبی تفریقات بھلا چکے تھے، کیونکہ یاسمین نے بھی کبھی کسی کے ساتھ بھلائی کرتے مذہب نہ دیکھا تھا۔

وہ ہم آواز ہو کر، حق کا نعرے امرتسر کی گلیوں میں بلند کر رہے تھے۔ اور ان کی منزل تھی پولیس اسٹیشن جہاں اسے قید کیا گیا تھا۔

گھنٹے بعد پولیس اسٹیشن کے باہر کا منظر بالکل بدل گیا۔ خالی سڑک سُرخ انگارہ چہرے اور پھولی چھاتیوں والے ہندوستانیوں سے بھر گئی تھی۔

انھیں بھاری تعداد میں دیکھ کر، ایسا گمان ہوتا تھا جیسا پورا امرتسر اپنی رہائش گاہوں سے نکل آیا ہو۔

ان مختلف قدوقدامت، مذاہب اور رنگوں کے لوگوں میں بس ایک چیز مشترکہ تھی۔ وعدہِ وفا!

پولیس اسٹیشن کے سامنے وہ ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئے۔ پہلی صف میں البرٹ ونسٹن بیٹھا ہوا تھا۔

"انقلاب زندہ باد!"

"ہم سب کو ملے گی، آزادی!"

"یاسمین کو، آزاد کرو!"

"برٹش راج مردہ باد"

سب کی آوازیں آپس میں مل چکی تھیں۔ اور آج ان آوازوں میں ایک آواز اس برٹش مرد کی بھی تھی۔

کوئی طاقت اب ان کو اپنا حق لینے سے روک نہیں سکتی تھی۔

......☆☆☆......

وہ بدحواس سے عالم میں اس پتھریلے فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس پر غنودگی طاری ہونے ہی لگی تھی کہ باہر سے آتی آوازوں نے اسے بیدار کیا۔

"سر، اب ہم کیا کریں۔ پورا شہر اس کے لیے جمع ہو گیا ہے۔ وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ اگر خدانہ خواستہ پولیس اسٹیشن میں داخل ہو گئے تو ہم سب مارے جائیں گے۔" جو آواز اسے سنائی دے رہی تھی اس میں پریشانی تھی۔

اس نے گردن اٹھائی۔ اس نے اپنے لوگوں پر فخر محسوس کیا تھا۔ وہ یہاں تنہا نہیں تھی، اس کے لوگ اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ ہر کرب کے باوجود وہ آسودگی سے مسکرائی۔

"تو دوسرے شہروں سے مابز بلواؤ۔ ان کو یہاں سے جلد از جلد نکالنا ہو گا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس باغی عورت کی سزائے موت میں کوئی تاخیر ہو۔"

سیاہ آنکھوں میں پریشانی کے باعث لرزش پیدہ ہوئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھی۔ وہ مضطرب ہونے لگی۔ اس کی جان چلی جاتی، اسے منظور تھا۔ مگر اس کے پیچھے اس کے لوگوں کی جان جانا اسے کسی صورت قبول نہ تھا۔

"سر ہم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ۔" آواز میں ہچکچاہٹ تھی۔

"کیوں؟" آواز برہم تھی۔

"کیونکہ ان احتجاجیوں میں البرٹ ونسٹن بھی شامل ہے۔ اسی نے یہ احتجاج شروع کروایا ہے۔ ہم اس کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔"

نام سن کر سیاہ آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ کندھے شل ہوئے اور بھنویں اٹھ گئیں۔

البرٹ؟ وہ زیرلب بڑبڑائی۔

آنکھوں کے سامنے گزشتہ رات کا منظر چل پڑا۔

وہ اس کے سامنے کھڑا تھا، مگر وہ اسے نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت اس نے اس کی شہد رنگ آنکھوں کو

نظر انداز کیا تھا، جو اس سے چلا چلا کر کہہ رہی تھیں کہ وہ بے قصور تھا، یہ الزام ایک گڑھے ہوئے جھوٹ سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

"یہ سب جھوٹ ہے۔" البرٹ کی کرب آلود آواز اسے یاد آئی۔

وہ اسے غلط سمجھی تھی۔ اس سے خطاء ہوئی تھی۔

احساسِ ندامت نے اسے گھیر لیا تو اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ اس کی حقارت اور نفرت سے بھرپور نظروں نے نہ جانے اسے کتنی تکلیف دی ہو گی؟ وہ رات اس نے کیسے گزاری ہو گی، یہ جان کر کہ وہ پچھلا کیا سب بھلا گئی تھی اور ایک من گھڑت بات پر اس سے گھن کھانے لگی تھی؟

اس نے گردن اٹھا کر چھت کو دیکھا۔

کوئی اتنا احمق کیسے ہو سکتا ہے؟ سوچ کر سر جھٹکا، اور پھر سے آنکھیں بند کر لیں۔

......☆☆☆......

پانچ دن بعد۔۔۔

لوئیس سربراہی کرسی پر براجمان، چکنی پیشانی پر بل لیے ایک پرچہ پڑھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ باہر بیٹھے احتجاجیوں سے وہ اکتا چکے تھے۔ ان کے سامنے جیمس کھڑا تھا، جس کی بھوری آنکھیں الجھن میں مبتلا تھیں۔

کاغذ پڑھ کر انھوں نے اسے مٹھی میں جکڑ لیا۔ آنکھوں میں طیش ابھرا، جسے وہ مہارت سے چھپا گئے۔

"آرڈرز آگئے ہیں۔ ہمیں اسے آزاد کرنا ہو گا۔" انھوں نے میکانکی انداز میں کہا تو جیمس کی بھنویں اٹھ گئیں۔

وہ بے یقینی کے عالم میں گردن نفی میں ہلانے لگا۔

"آپ ایسے کیسے، اسے نکلنے کی اجازت دے سکتے ہیں، سر؟ یہ دنگا فساد کرنے والی ہے۔ ہم ان لوگوں کے ہاتھوں دب نہیں سکتے۔" وہ بلند آواز میں بولا۔ وہ کسی صورت یاسمین کی آزادی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

لوئیس کے چہرے کی رنگت اڑ گئی۔

انگیزشِ عدل

"ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں۔ البرٹ دھوپ میں سڑ رہا ہے، یہ خبر فرینک ونسٹن تک پہنچ چکی ہے۔ ہمیں اوپر سے احکام آئے ہیں۔" لوئیس کی آواز نرم ہوئی۔

جیمس آنکھوں میں درشتی لیے انھیں دیکھتا گیا۔

"نہیں سر۔ ہم اپنی حکومت سے بغاوت کرنے والوں کو یوں نہیں چھوڑ سکتے۔ آپ کیسے ہار مان سکتے ہیں؟ ہم کیسے انھیں جیتنے دے سکتے ہیں؟" وہ بدستور بولا۔

لوئیس نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔

"ہم بے بس ہیں، جیمس۔"

"مگر سر۔۔"

جیمس کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ لوئیس کھڑے ہوئے اور اسے خاموشی طلب نظروں سے دیکھا۔

"آرڈرز پکے ہیں، جیمس۔ ہمیں اسے نکالنا ہو گا۔" سست چال چلتے وہ اس کے مقابل کھڑے ہو گئے۔

جیمس نے ان کی آنکھوں میں کچھ معنی خیز دیکھا تھا۔ اور پھر ان کے لبوں کو ایک فتنہ گر مسکراہٹ میں پھیلتا دیکھ کر، اس نے جان لیا تھا کہ وہ بھی اس کی طرح ہار تسلیم کرنے والے نہ تھے۔

لوئیس جیمس کے کان کی جانب جھکے۔ آنکھوں میں عیاری اتری۔

"تمھیں کیا لگتا ہے، ان باغیوں کو میں معاف کر سکتا ہوں؟" کہہ کر زیرِ لب ہنس دیے۔

"ابھی اسے رہا کر دو۔ آگے وہ مسئلے نہ پیدا کرے، اس کی ذمہ داری تمھارے اوپر ہے۔" کانوں میں سرگوشی کی۔ لبوں پر پھیلی شیطانی مسکراہٹ سمیٹی اور سیدھے ہو گئے۔

جیمس کے لب پھیلے۔ بھوری آنکھوں میں شر کی آمیزش ہوئی۔

"کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو، جیمس؟" وہ اعتماد سے بولتے اس کے کندھوں سے نادیدہ جھول جھاڑنے لگے۔

جیمس نے سر کو ادب سے خم دیا۔

یاسمین کو مات دینا، اس کی انا کا معاملہ بن چکا تھا۔

اور وہ اپنی انا کو زخمی کرنے والوں کے ساتھ سمجھوتے کرنے کا قائل نہ تھا۔

......☆☆☆......

انھیں ڈیرہ ڈالے ہوئے پانچ دن بیت چکے تھے، مگر ان کی ہمت اب تک پسماندہ نہ ہوئی تھی۔ گزشتہ دنوں سے، وہ اپنی خوراک کو بالائے طاق رکھے ہوئے تھے، صرف اور صرف عدل کی خاطر۔

البرٹ کا حال بدحال ہو چلا تھا۔ جسم سوکھ چکا تھا۔ چہرے کا ہر زاویہ مرجھا گیا تھا۔ اس پر سب خود بیت رہی تھی اس لیے اسے یاسمین کی باتوں کی سمجھ آنے لگی تھی۔ اس نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ جو لوگ احتجاج کرتے ہیں، وہ اذیت سے گزرتے ہیں، مگر پھر بھی اپنی ذات کو اس تکلیف سے گزارتے ہیں۔

کال کوٹھری کے اندر یاسمین گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ چہرا ہمیشہ کی طرح ٹھنڈا اٹھار تھا، اور آنکھیں پرسکون اور بے خوف۔

جیمس وہاں پہنچا تو اپنی آنکھوں کی حیرت وہ خود بھی چھپا نہ سکا۔ وہ لڑکی آخر ٹوٹتی کیوں نہ تھی؟ ان کے کسی حربے نے اس پر اثر کیوں نہ کیا؟ وہ اسے دیکھتے، خود سے سوال کر رہا تھا۔

"آزاد کر دو اسے۔" وہ اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے بولا۔ سپاہی چوکنّا ہوئے۔

اس نے یاسمین کے ردِ عمل پر غور کیا، مگر یاسمین میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ بدستور اطمینان کے ساتھ بیٹھی رہی۔ جیمس کو پہلے سے زیادہ حیرت ہوئی۔

کال کوٹھری کا دروازہ کھل چکا تھا۔

"تم جا سکتی ہو۔" وہ تذبذب کے عالم میں بولا تو وہ کھڑی ہو گئی۔

اس کا جسم چیخ رہا تھا، چال بھی کمزور تھی، مگر اس نے اپنے چہرے پر تکلیف کے آثار جھلکنے نہ دیے۔ وہ اسی رعب کے ساتھ باہر کا سفر طے کر رہی تھی، جو اس کی شخصیت کا حصہ بن چکا تھا۔ جو اب اس سے کسی صورت جدا نہ ہو سکتا تھا۔

البرٹ نے جیسے ہی تھانے سے باہر آتی یاسمین کو دیکھا، اس کے اندر توانائی بھر گئی۔ دل بے قابو ہو گیا اور وہ

کھڑا ہو گیا۔ لب بے ساختہ مسکرانے لگی اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ اب بھی ویسی ہی تھی، حوالات کی سختیوں نے نہ اس کی شان و شوکت چھینی تھی، نہ ہی اس کی گردن کی اکڑ۔

البرٹ کو احساس ہوا، کہ وہ اس دیدار کے لیے ترس چکا تھا۔ ان سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر اس کے اندر تک ٹھنڈ اترنے لگی۔

احتجاجیوں میں شور و غل پھیلنے لگا۔ وہ سب کھڑے ہونے لگے۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹیں سجی تھیں، آنکھیں جیت کا جشن منا رہی تھیں۔ یاسمین کے دیدار نے، ان سب کے لیے کسی خوراک کا کام کیا تھا۔

ان کی آنکھیں، مسکراہٹیں دیکھ کر یاسمین کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے آسمان کو تک کر معبودِ حقیقی کا شکر ادا کیا پھر اپنے لوگوں کو دیکھا۔

اب وہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی پھیل گئی۔ سب منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اور ان سب منتظر نگاہوں میں سب سے زیادہ منتظر نگاہیں اس برطانوی مرد کی تھیں۔ سب سے زیادہ پھیلی ہوئی مسکان بھی اسی کی تھی۔ سب سے زیادہ چمکتی ہوئی آنکھیں بھی اسی کی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے برسوں کی محنت کا پھل اسے آج ملا ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے صدیوں کی ریاضت کا صلہ اسے اس لمحے یاسمین کے دیدار سے ملا ہو۔

"یہ جیت، یہ فتح یہ تو بس ایک قدم ہے۔ اس آزادی کی طرف جس کے لیے ہم سب اپنے گھروں سے نکلتے ہیں۔" اس کے بلند آواز اس ہجوم میں مرتعش ہوئی۔ سب کے سب سانسیں تھام کر اسے سننے لگے۔

"یاد رکھیں۔ بغاوت فرض ہے۔ ہم پر، آپ سب پر۔ ظلم کرنا، اور ظلم سہنا دونوں غلط ہیں۔ اور ہم ہر ظلم کو سہنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم اپنے بچوں اپنے باپ بھائیوں اور شوہروں کے بہتے لہو کو فراموش نہیں کر سکتے۔ ہم آج ایک ہو کر سڑکوں پر نکلے ہیں۔ ہم آئندہ بھی نکلتے رہیں گے۔ خواہ کوئی قید، خواہ موت کا خوف ہمیں اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔"

وہ جذباتیت سے لبریز آواز میں کہہ رہی تھی۔ سیاہ آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ اس کے الفاظ نے اور بھی بہت سی

آنکھوں کو بہنے پر مجبور کیا۔

”ہم آزادی کے دن تک حق کا نعرہ بلند کرتے رہیں گے۔ اسی لیے میرے ساتھ نعرہ لگاؤ!“ ٹھہر کر ہجوم پر سرسری نگاہ ڈالی۔

”انقلاب زندہ باد!“ وہ ہاتھ اٹھا کر بلند آواز میں بولی تو سارا ہجوم اس کے پیچھے نعرہ بلند کرنے لگا۔

”انقلاب زندہ باد!“ اور وہ لوگ بدستور نعرے بلند کر کے اپنی جیت کا جشن منانے لگے۔

ان سب کی آنکھوں میں امید کی رمق تھی۔

البرٹ یاسمین کو دیکھ کر فخریہ سا مسکرایا۔

یاسمین کی نگاہیں اس پورے ہجوم سے ہوتے ہوئے اس شہد رنگ آنکھوں والے مرد پر ٹکیں۔ ان آنکھوں میں کوئی عناد، کوئی نفرت نہ تھی۔ جب کہ وہ نفرت کی حقدار تھی۔ وہ ناراضگی کی حقدار تھی۔ وہ سب بھلا کر، اس کی رہائی کا جشن منا رہا تھا۔

آخر ہر انسان البرٹ جیسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ اس نے اندر ہی اندر سوچا۔

ہجوم چھٹنے لگا تھا۔ البرٹ اپنی دھن میں چلتا ہوا ایک گھنے درخت کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ یاسمین سب چھوڑ کر اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

شہد رنگ آنکھوں کی نظر اس کے خون آلود کرتے پر پڑی۔ اسے درد ہوا۔ کاش اس قید میں اذیت سہنے والا کوئی اور نہیں وہ خود ہوتا؟ کاش!

وہ اس کے سامنے کھڑی، خوش مگین مسکراہٹ کے سنگ اسے دیکھ رہی تھی۔ اور وہ اسے اداسی سے دیکھ رہا تھا۔

”باغی بن کر کیسا لگا؟“ وہ اپنے ازلی بلا تاثر انداز میں بولی۔

وہ اس اداس سے چہرے کے ساتھ ہی ہنس دیا۔

”کاش اس کال کوٹھری میں ہوتا۔ کاش۔ یہ زخم آپ کے نہیں، میرے جسم پر لگے ہوتے۔ کاش۔ کاش خون

میرا ابھا ہوتا۔" وہ آبدیدہ ہوا۔

یاسمین کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ اسے اس سفید مرد پر یقین ہی نہ آیا۔

"کیا تم واقعی سب بھول گئے البرٹ؟ تمھیں ہم سے بے اعتنائی برتنی چاہیے تھی۔ خفا ہونا چاہیے تھا۔ خود کو ہماری نظروں سے دور کر لینا چاہیے تھا۔ اور تم ہو ہماری جگہ اس عبرتاک قید میں جانے کی خواہش ظاہر کر رہے ہو؟" وہ متحیر لہجے میں بولی۔

وہ مرد عرصے سے اس سے اس کی باتوں پر لاجواب ہو جاتا تھا۔ اب لاجواب ہونے کی باری یاسمین مجاہد کی تھی۔

"بے اعتنائی؟ خفگی؟ یاسمین۔ میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ مگر کبھی آپ سے خفا نہیں ہو سکتا۔ جان لیجیے، آپ کو اجازت ہے مجھ پر ظلم ڈھانے کی۔"

یاسمین گنگ ہوئی۔ الفاظ زبان پر دستک دیتے مگر ادا نہ ہو پاتے۔ اس نے بے ساختہ دو قدم پیچھے بڑھائے۔ اس کی باتوں سے نہ جانے کیوں اسے خوف آیا۔

"کیوں؟ آخر کیوں؟" وہ آنکھیں چھوٹی کیے بولی۔

البرٹ کے دل پر گراہ سی لگ گئی۔ بہت کچھ تھا جو دل میں سما گیا تھا۔ بہت جملے تھے، فقرے تھے جو کہے جانے کے منتظر تھے۔ مگر اس بہت کچھ کا زبان تک آنا دشوار تھا۔

"کیونکہ میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ اور کرتا رہوں گا۔" وہ بس اتنا سا کہہ سکا۔ "کیونکہ آپ نے مجھے سچ سے روشناس کروایا ہے۔ انسان سب بھول سکتا ہے، مگر اپنے مسیحا کو نہیں بھولتا۔ آپ میرا مسیحا ہیں، یاسمین۔" وہ نرم صحبت مسکراہٹ سجائے گویا ہوا۔

یاسمین اب تک اسے بے یقینی سے دیکھتی گئی۔ دل بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ ان شہد رنگ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے، ان میں کھو جانا چاہتی تھی۔

"ہمیں چلنا چاہیے۔" وہ یکدم بول اٹھی۔

دماغ دھندلانے لگا تھا۔ وہ اس سے اور بات کرتی تو شاید پھٹ پڑتی۔ اور وہ پھٹنا ہی تو نہ چاہتی تھی۔

البرٹ نے اس کی طرف الوداعی مسکراہٹ اچھالی۔

"جلد ملتے ہیں۔"

جواباً وہ کچھ نہ بولی۔ بس سر اوپر نیچے ہلاتے اس بھیڑ میں کہیں گم ہو گئی۔

......☆☆☆......

چمنِ گلاب ایک بار پھر سے آباد ہو گئی تھی۔

وہ بیکری جو پچھلے ہفتے سے ویران تھی، آج وہاں شور و غل پھیلا ہوا تھا۔ دروازہ کھلنے پر وہی گھنٹی کی آواز گونجی۔ ایک بار پھر سے چمنِ گلاب کیکس اور بسکٹس کی مہک سے جی اٹھی تھی۔

باورچی خانے میں یاسمین ڈبل روٹی کا آٹا گوندرہی تھی۔

ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا۔

عام حالات میں، وہ نظریں نہیں اٹھاتی تھی، مگر آج جو آیا تھا، وہ اس کے انتظار میں تھی۔

بھاری بھر کم روشی سست قدم بڑھاتے اندر داخل ہوئی تھی۔

"لڑکیوں!" اس کی کرخت آواز گونجی تو سب نے اپنا کام روک لیا۔

روشی بوکھلاہٹ کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"سب کمرے سے چلی جاؤ۔ ہمیں اور روشی کو تنہا چھوڑ دو۔" سیاہ آنکھوں میں سختی در آئی۔

ملازمین نے حکم کی اطاعت کرتے سر کو خم دیا اور باورچی خانے کو خیر باد کہہ کر چل دیں۔

باورچی خانے کی اس پر اسرار فضا میں وہ دونوں تنہا تھے۔

یاسمین قدم قدم بڑھاتے روشی کے مقابل کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر وہ یک ٹک اسے دیکھتی گئی۔ ان نظروں نے روشی کا سکون غارت کر دیا تھا۔ آنکھوں سے انسانوں کو کیسے مارا جاتا ہے، یاسمین مجاہد کو بخوبی آتا تھا۔

"یاسمین صاحبہ، آپ نے جلدی میں بلایا اس لیے میں آگئی۔" روشی کی آواز لڑکھڑائی۔

"دو دنوں سے چمنِ گلاب کھلی ہوئی ہے، مگر تم نظر نہیں آتی۔ سب خیریت ہے۔" وہ ٹھنڈے ٹھار لہجے میں بولی۔

روشی کی گردن بے ساختہ جھک گئی۔

"میری۔۔۔ میری طبیعت ناساز تھی۔ میں خبر نہ پہنچا سکی، اس لیے معذرت۔" آواز ہنوز لرز رہی تھی۔

"طبیعت ہی خراب تھی، یا آپ کو شرم و ندامت نے چمنِ گلاب واپس نہ آنے دیا؟" وہ چبا چبا کر بولی۔

روشی کے اوپر فضا کا تناؤ بڑھنے لگا۔ اسے لگا جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر یاسمین کی خونخوار آنکھوں میں دیکھا تو اس کا سانس تک لینا محال ہو گیا۔

وہ جان گئی تھی کہ یاسمین اس کے اعمال کی ناپاکی سے باخبر تھی۔ آنکھوں کے گوشے نم ہوئے۔ دل نچوڑنے لگا۔

"میں۔ میں بہت شرمندہ ہوں اپنے فعل پر مگر۔۔۔" وہ بول ہی رہی تھی کہ یاسمین کی گرجدار آواز نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بس کرو، روشی!" اس نے ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔ "جس تھال میں کھایا، اسی میں چھید کیا؟ کیا تمھیں ایسا لگا تھا کہ ہم روز روز تمھارے نئے نویلے زیورات نہیں دیکھتے تھے؟ کیا تم بھول گئی تھی، کہ ہم تمھارے حالات سے باخبر تھے۔" یاسمین کا چہرا سُرخ ہوا اور سانسیں تیز۔

روشی نے نظریں اٹھائی رکھیں، مگر گردن کو اب وہ اٹھا نہ پائی۔

"تم غربت و افلاس میں مبتلا تھی، تب ہم تمھیں چمنِ گلاب میں لے کر آئے تھے، تاکہ تم اپنے بچوں کو عزت کی کمائی روٹی کھلا سکو۔ نہیں نہیں، ہم نے کوئی احسان نہیں کیا، نہ ہی ہماری کوئی عنایت تھی، یہ اللہ کا کرم تھا تم پر۔ اس نے تمھیں عزت بخشی تھی۔ مگر تم نے، تم نے اس عزت کو لات مار کر، اپنے ہی لوگوں کے ساتھ دغا کر دیا؟ کیا شرم نہیں آئی؟" وہ خاموش ہوئی۔ سانسیں اب تک پھول رہی تھیں۔

روشی کی آنکھوں سے آنسو تیر کر رخساروں کو بھگو رہے تھے۔

انگیزشِ عدل

”مجھے معاف کر دیں یاسمین صاحبہ۔ زیورات کی لالچ نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ میں نے چور راستہ اختیار کرنا چاہا۔ مگر یقین کریں، اس رات سے آج تک میں سکون کی نیند نہیں سو سکی۔ جب تک آپ قید میں رہی تھیں، میں مصلے پر بیٹھ کر آپ کے لیے دعائیں مانگتی رہی۔“ روشی کی آواز رقت آمیز ہوئی۔ چہرا آبدیدہ تھا۔

یاسمین نے گردن نفی میں ہلائی۔

”اپنی دعائیں، اپنے پاس رکھو، روشی۔ ہمیں ان کی ضرورت نہیں۔“ وہ لہجے میں کاٹ لیے بولی۔

”پتہ ہے، آج ہم تمھیں گردن اٹھانے کا نہیں کہیں گے۔ کیونکہ تم جیسے دغاباز جھکی گردنوں کے مستحق ہیں۔ ابھی اسی وقت، ہماری نظروں سے خود کو دور کر دو، روشی۔ تمھارے اوپر، پر بس ایک آخری التفات یہ کر دیں گے کہ اس جرم کو اپنے اور خدا کے درمیان رکھیں گے۔ اس کے علاوہ ہم سے کسی عنایتِ خاص کی توقع نہ رکھنا۔“ اس نے تلخ لہجے میں حکم سنایا۔

روشی نے گردن نفی میں ہلاتے اوپر اٹھائی۔

”ایسے نہ کریں، یاسمین صاحبہ۔ میں واقعی نادم ہیں۔ میں اپنی غلطی کو درست کرنا چاہوں گی۔“ وہ منت کرنے لگی۔

یاسمین نے نظریں پھیر لیں۔

”غلطیاں درست کرنے کا وقت چلا گیا ہے، روشی۔ ساری کوششیں بے فیض ہیں۔ عافیت اسی میں ہے، کہ اب تم یہاں سے چلی جاؤ۔“ اس نے جو کہنا تھا، وہ کہہ چکی تھی۔ میز کے پیچھے پہنچ کر وہ پھر سے آٹا گوندھنے لگی۔

روشی شاک کے عالم میں یاسمین کو دیکھنے لگی۔ وہ رحم دل یاسمین، جس نے اسے بیکری میں جگہ دے کر رحم بخشا تھا، آج سنگدل ہو گئی تھی۔ اسے خود کے کیے پر گہرا افسوس ہوا۔

تھک ہار کر وہ وہاں سے رُخصت ہو گئی۔

اس کے پیچھے، یاسمین نے ٹھنڈی سانس خارج کی۔

چہرے پر فکرمندانہ لکیریں پھیلیں۔ اسے بس ایک ہی خیال ستا رہا تھا۔

انگیزشِ عدل

کیا روشی جیسے کھوٹی نیت والوں کے ہوتے ہوئے، وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے تھے؟

......☆☆☆......

وہ سرائے کے اس کمرے میں، نیم دراز سا ہو کر سو رہا تھا۔ کمرے میں ہر طرف اس کے خراٹے گونج رہے تھے۔

یکبارگی دروازے پر دستک ہوئی تو وہ بیدار ہوا۔

"مسٹر البرٹ۔ چمنِ گلاب سے آپ کا سامان آیا ہے، اور ایک خط بھی۔" الفاظ کان میں داخل ہونے کی دیر تھی کہ وہ اٹھ بیٹھا۔ ساری غنودگی زائل ہو چکی تھی۔

اس نے بلا تاخیر دروازے کا رُخ کیا اور اسے کھولا۔ مسکرا کر اس نے بھورا لفافہ اور وہ خط موصول کیا۔ ہفتے بھر سے، اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی، اس لیے یاسمین سرائے میں اپنی بیکری کی کوئی سوغات اسے پہنچا دیتی تھی۔

البرٹ نے بھورا لفافہ میز پر رکھا اور وہ خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

"البرٹ،

امید کرتے ہیں، تم بخیرت ہوگے اور صحتیابی کی طرف لوٹ رہے ہوگے۔ ہمیں اطلاع ملی کہ تم دو دن بعد برطانیہ لوٹ رہے ہو۔

اگر آج بہتر محسوس کرو تو مغرب کے بعد ہمارے گھر کے باہر آ جانا۔ ہم تمھیں کچھ دینا چاہتے ہیں۔

یاسمین۔"

اس خط کو پڑھتے ہی البرٹ کے چہرے پر مسکان بکھر گئی۔ ساری تکان کا صفایا ہو چکا تھا۔ ایک نرالا سا احساس اس کے دل میں سما گیا تھا۔

اس نے بڑی بے چینی و بے قراری کے سنگ مغرب تک کا وقت کاٹا تھا۔ پھر الماری سے نیا نویلا کوٹ نکالا۔ نئی ٹائی نکالی۔ نہا دھو کر اچھے سے تیار ہوا۔ اور یاسمین کی طرف چلا گیا۔

......☆☆☆......

انگیزشِ عدل

آسمان گہرے جامنی رنگ کا ہو چکا تھا۔ چاند آج اکیلا نہیں تھا۔ اس کی تنہائی کو مٹانے کے لیے درجنوں ستارے بھی موجود تھے۔ ان کی چمک دمک نے اس پر سکون رات کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا تھا۔

گلی کے اس حصے سے ٹھنڈی ہوائیں گزر رہی تھیں۔ وہ اس کے گھر کے باہر کھڑا، اس کیاری کو تک رہا تھا، جس میں گلاب کے پھولوں کے ساتھ یاسمین کے پھول بھی کھلے ہوئے تھے۔

یکبارگی گلی کے کونے میں اسے یاسمین کا ہیولہ نظر آیا۔ وہ چوکنّا ہو گیا۔

شہد رنگ آنکھیں خوشیوں سے بھر گئیں۔ وہ جیسے جیسے اس کے قریب آ رہی تھی، اس کی خود ساختگی میں اضافہ ہوتا گیا۔ نبض تیز ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اس کے عین سامنے کھڑی تھی۔

گندمی لڑکی اس دراز قد مرد کو نظر اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔

"اب کیسے ہو؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔ آخر میں وہ مسکرا دی۔

وہ پہلے تو ایسے نہ مسکرایا کرتی تھی؟ البرٹ نے دل ہی دل میں سوچا۔

"آپ نے دعوت دی، تو ٹھیک ہونے میں ایک لمحہ نہ لگا۔" وہ چہرے پر مبہم مسکراہٹ سجائے گویا ہوا۔

"اگر اتنا بے تاب تھے تو پہلے بتاتے، ہم پہلے ہی ملاقات کا دعوت نامہ بھیج دیتے۔" وہ شریر انداز میں بولی۔

البرٹ زیر لب ہنس کر، نظریں چرا گیا۔ رخسار سُرخی مائل ہوئے۔

اور وہ، وہ بس اسے دیکھتی گئی۔ اس کے چہرے سے نظریں ہٹانے کا دل ہی نہیں کر تا تھا۔

"تم ادھر رکو، ہم ابھی آئے۔" لبوں پر رازدارانہ مسکراہٹ سجائے گویا ہوئی۔

البرٹ نے نظریں اٹھائیں۔ نگاہیں بے تاب اور منتظر تھیں۔

"چلیں شکر۔ میرے دماغ میں کب سے یہی کھجلی ہو رہی ہے، کہ آخر آپ، مجھے دینے کیا والی ہیں۔"

"جو بھی ہے، تمھیں بہت اچھا لگے گا۔" اتنا سا کہہ کر وہ چلی گئی۔

کچھ ساعتیں البرٹ نے انتظار میں کاٹ دیں۔ دل بے چینی کے عالم میں مچل رہا تھا۔ کہنے کو تو وہ چند منٹ ہی تھے، مگر ایک ایک سیکنڈ کسی گھنٹے کی طرح گزرا۔

وہ دروازے پر نمودار ہوئی۔ البرٹ نے آنکھوں میں منت لیے اسے دیکھا، جیسے کہنا چاہ رہا ہو ”کہ بس اب ختم کریں انتظار کو“۔ اب وہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں، بھورے چمڑے کے سرورق والی ایک کتاب تھی۔

”آخر کیا دینا ہے، یاسمین؟“ وقت واقعی اس کی صبر آزمائی کر رہا تھا۔

اس کی بے قراری دیکھ کر یاسمین کھل کھلا دی۔

اس نے وہ کتاب آگے بڑھائی تو البرٹ نے آنکھوں میں سوال لیے اسے تھام لیا۔

جیسے ہی اس نے کتاب کھولی اس کی آنکھوں میں خوشگوار حیرت پھیلی۔

اور بس۔۔۔ یاسمین کو لگا جیسے اس منظر سے زیادہ حسین اس نے کچھ نہ دیکھا تھا۔ جب وہ خوش ہوتا تھا تو وہ خود کو مکمل محسوس کرتی تھی۔

”اسے تم، ہمارا معافی نامہ سمجھ لو۔“ اس نے مسکراہٹ سمیٹ کر سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم نے تمھیں غلط جان کر، تمھاری نیت پر شک کر کے بہت بڑی غلطی کی۔ امید ہے تحفہ تمھیں پسند آئے گا۔“ وہ خلوص سے بولی۔

البرٹ نے کتاب سے نظر اٹھا کر یاسمین کو دیکھا۔

”میں آپ سے کبھی خفا ہوا ہی نہیں تھا۔“ اس نے کہہ کر وقفہ لیا۔ ”شاید خفا ہو ہی نہیں سکتا۔“ آواز دھیمی ہوئی۔ اس نے سلسلۂ کلام جوڑتے بات جاری کی۔

”اور میں اس تحفے کے لیے لفظوں میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ میں انگلینڈ پہنچ کر ایک ایک ترکیب بناؤں گا، اور تفصیلی تبصرے خطوط میں لکھ کر آپ کو بھیجا بھی کروں گا۔“

انگلینڈ کا سنتے ہی یاسمین کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔ البرٹ نے بھی اس کی سمٹتی مسکراہٹ پر غور کیا تھا۔ دل میں کہیں چبھن ہوئی۔

”کاش میں، کاش میں ساری زندگی ہندوستان میں رہ سکتا۔“ اس کا جوش و خروش دھواں دھواں ہوا اور مسکراہٹ سمٹ گئی۔

انگیزشِ عدل

یاسمین کی سیاہ آنکھوں کی چمک ماند پڑی۔ ان میں ایک آس سی پنپی، ایسی آس، کہ جس کا اظہار وہ نہیں کر پا رہی تھی۔ مگر وہ آس اظہار کی ضد کر رہی تھی۔ وہ ڈھیٹوں کی طرح اس ضد کو نظر انداز کرتی گئی۔

"مگر کس حیثیت سے رہوں گا، یاسمین؟" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ دل زور و شور سے دھڑک رہا تھا۔

خاموشی ان کے درمیاں حائل ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے گئے، وہ کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ گئے تھے۔ پیغامات نے سفر طے کیا، ایک دل سے دوسرے دل تک۔

"ہم تمھیں بدائی کہنے ضرور آئیں گے، البرٹ۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔ ایک دفعہ پھر سے، وہ اپنے کرب کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

پچھلی بار کے برعکس، البرٹ اس کرب کو پل بھر میں بھانپ چکا تھا۔

"چلا بھی جاؤں تو۔۔۔" البرٹ نے نظریں جھکائیں۔

یاسمین نے جواب طلب نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تو؟" وہ بے اختیار بولی۔

البرٹ نے نظریں اٹھائیں۔ شہد رنگ آنکھوں میں ایسی آرزو تھی جو کبھی پوری نہ ہو سکتی تھی۔ وہ دونوں جانتے تھے، یہ آرزو ایسی منزل کی طرح تھی، جس تک پہنچنا دونوں کے بس میں تھا ہی نہیں۔

"چلا جاؤں گا، مگر اپنے وجود کا ایک حصہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں چھوڑ جاؤں گا، یاسمین۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا اور اسے پورے وثوق سے یاسمین کو دیکھے گیا۔ آج وہ اسے جی بھر کر دیکھ لینا چاہتا تھا۔

یاسمین کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا اٹک گیا۔ وہ مزید اپنے جذبات کی نفی نہیں کر پا رہی تھی۔ مگر ان جذبات کا فائدہ ہی کیا، جن سے کچھ حاصل ہی نہ کیا جا سکتا تھا؟ ہر خواہش پوری ہونے والی نہیں ہوتی۔ وہ بھی یہ بات جانتی تھی۔

وہ دو مختلف راہوں کے مسافر تھے۔

راہیں ملی تو تھیں، مگر ان کی تقدیر میں تھا جدا ہونا۔

جدائی کا وقت سر پر کھڑا تھا۔

اور جدائی سے زیادہ تکلیف دہ بھی کچھ ہوتا ہے کیا؟

"شاید تمہیں جانا چاہیے۔ دیر ہو رہی ہے۔" اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ اس سے دور جانا چاہتی تھی۔ بہت دور۔ وہ لاحاصل تھا۔ تاعمر لاحاصل رہنے والا تھا۔

البرٹ نے اس کی آواز میں گھلی نمی محسوس کی تھی۔

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ہونٹ ایک مرتبہ پھر تبسم میں ڈھلے۔

وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا، مگر پھر اس کی مسکراہٹ بجھ گئی۔ آنکھوں کو پتلیاں سکڑ گئیں۔ اسے گلی کے کونے میں، دیے کی زرد روشنی میں ایک چہرا نظر آیا۔۔۔

ایک شناسا چہرا۔۔۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ شہد رنگ آنکھیں خوف کی شدت سے کپکپائیں۔

یاسمین نے اس کے بدلتے انداز دیکھے تھے۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں الجھن ابھری۔

البرٹ نے یاسمین کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور اس کے ساتھ گول چکر کھایا۔ اب وہ یاسمین کی جگہ پر تھا، اور یاسمین اس کی۔ یاسمین بوکھلائی ہوئی تھی، اور اس عمل کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یکدم گلی میں گولی کی زور دار آواز گونج اٹھی۔

ساری دنیا تھم گئی۔

سانسیں جو جاری ہونی تھیں، وہ اٹک گئیں۔

دل جسے دھڑکنا تھا، وہ لحظہ بھر دھڑکنا بھول گیا۔

اس نے گلی کے کونے میں دیکھا، وہاں جیمس کھڑا تھا، جس کے ہاتھ میں لوہے کی پستل تھی۔ اس کے چہرے پر خوف و انتشار پھیلا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ سے پستل چھوٹ کر زمین پر جا گری۔ اس نے غلط انسان پر گولی چلا دی تھی۔ اس نے پہلی فرصت میں راہِ فرار اختیار کی۔

اس نے پسٹل کے زمین سے ٹکرانے کی آواز بھی سنی تھی۔

اس نے اپنے سامنے دیکھا۔

شہد رنگ آنکھیں تکلیف میں جھلس رہی تھیں۔

سفید چہرے پر کرب سمایا ہوا تھا۔

ہونٹ سفید پڑ گئے تھے اور لرزش میں مبتلا تھے۔

سیدہ یاسمین مجاہد کو لگا کہ اس کی روح کسی نے چھلنی کر دی تھی۔ اس دن البرٹ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ کاش وہ اس کی جگہ قید کی اذیت سہتا۔ آج وہ خواہش کر رہی تھی کہ کسی طرح وقت کو پیچھے گھما دے، اور البرٹ کی جگہ خود گولی کھالے۔

وہ اس کے سامنے زمین پر ڈھیر ہوا تھا۔ اس نے جھک کر اس کے سر کے نیچے ہاتھ رکھا۔ سیاہ آنکھیں آنسو بہانے لگی تھیں۔

آنکھیں البرٹ کے علاوہ کچھ بھی دیکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی تھیں۔ کان اس کی تکلیف دہ سسکیوں کے سوا کچھ بھی سن نہیں پا رہے تھے۔ بس وہ تھی، البرٹ اور زندگی کی تمام تر تلخیاں جو بڑی بے رحمی سے اس کے اوپر نازل ہوئیں۔

"البرٹ!" اس کے لب ہلے، مگر وہ کچھ بول نہ سکی۔۔۔

"البرٹ!" اپنی مدھم آواز اسے خود سنائی دی۔

"البرٹ!" اب کہ اسکی دل خراش چیخ سنائی دی۔

"البرٹ!" وہ اپنی توانائی کھو چکی تھی۔

البرٹ نے اکھڑتی سانسوں کے درمیان اسے دیکھا۔ جسم میں تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ تکلیف میں تھا، مگر یاسمین کو کرب میں دیکھنا اس پر گراں گزر رہا تھا۔ وہ اس کے آنسو پونچھ دینا چاہتا تھا، مگر اس کے ہاتھوں نے اس کا ساتھ نہ دیا۔

"یاسمین!" آواز کمزور اور لرز رہی تھی۔

یاسمین خاموش ہوئی۔ اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹ کر وہ اسے سننے لگی۔

"مجھے آج سمجھ آیا ہے کہ آپ سب اس زمین کے لیے جانیں قربان کرنے کو کیوں تیار ہو جاتے ہیں۔" اس نے وقفہ لیا۔ تکلیف کے باعث، بولنا دشوار تھا۔

"کیونکہ آپ سب اس زمین سے محبت کرتے ہیں۔ سچی محبت۔" وہ اونچی، گہری سانسیں لینے لگا تھا۔ پیر آپس میں اکڑنے لگے تھے۔ دنیا اندھیر ہو رہی تھی۔

وہ اس کے سینے پر آنسو بہاتی گئی۔ نمکین پانی سُرخ خون سے جا ملا۔

"میں بھی اپنے آپ کو آپ کے لیے قربان کرتا ہوں یاسمین۔ کیونکہ۔۔۔" پیروں سے جان نکلنے کو تھی۔

یاسمین اسے دیکھتے گردن نفی میں ہلانے لگی۔

"البرٹ! تم نہیں جا سکتے۔ تم نے برطانیہ پہنچ کر سب بنانا تھا نا۔" وہ پاگلوں کی طرح رو رہی تھی۔ "تم نے مجھے خط بھی لکھنے تھے، البرٹ۔"

"کیونکہ یاسمین۔۔۔" اس نے بات جاری رکھی۔ ہاتھ کپکپانے لگے تھے۔ شہد رنگ آنکھیں لرزیں۔ چہرا زردی مائل ہوا۔

"مجھے آپ سے سچی محبت ہو گئی تھی۔"

سانس کا ٹانکا ٹوٹ گیا۔

جسم نے حرکت کرنا بند کر دی۔

روح جسم کے پنجرے سے آزاد ہو گئی۔

شہد رنگ آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔

مگر افسوس۔۔۔

اب ان کی چمک، کبھی بھی لوٹائی نہیں جا سکتی تھی۔

......☆☆☆......

چھ ماہ بعد۔۔۔

سرائے کا وہ کمرہ ویران پڑا تھا۔

کمرے کی فضا بوجھل اور اداس تھی۔

دیواریں مایوس تھیں۔ شاید اب تک وہ اپنے پرانے مالک کو یاد کر کر کے آہیں بھرتی تھیں۔

وہ اس کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ سیاہ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے۔ رنگت بجھی بجھی، چال مرجھائی ہوئی۔ اپنے سر پر اس نے کستی سے دوپٹہ باندھا ہوا تھا۔

وہ الماری میں موجود اس کے کپڑوں کو دیکھ رہی تھی، اپنے ہاتھوں سے انھیں محسوس کر رہی تھی۔ وہ پچھلے چھ ماہ سے وقتاً فوقتاً یہاں آتی تھی۔ یہ کمرہ خالی نہ ہو جائے اس لیے اس کا کرایہ تک ادا کر دیتی تھی۔ مگر آج، یہ کمرہ خالی ہو جانا تھا۔ اور وہ اسے خالی ہو جانے سے روک بھی نہیں سکتی تھی۔

اسے وہ شدت سے یاد آیا۔ وہ شہد رنگ آنکھوں والا مرد۔ جو روز اس کی بیکری میں آ پہنچتا تھا۔ جو معمولی سے معمولی باتیں بھی مسکرا کر کرتا تھا۔

اور اسے بھلایا بھی کیسے جاتا؟ ایسے ہی ہوتے ہیں بعض انسان۔ آتے تو کچھ عرصے کے لیے ہی ہیں ہماری زندگیوں میں، مگر زندگی بھر کے لیے اپنی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں، اپنی یادیں چھوڑ جاتے ہیں، جن کے سہارے باقی کی زندگی گزار دینی پڑتی ہے۔

ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو وہ خود ساختہ مڑ گئی۔ عمر رسیدہ برطانوی مرد کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ان کا چہرہ بے رونق تھا۔

بالآخر اس کمرے کے خالی ہو جانے کی وجہ آ چکی تھی۔ وہ فرینک ونسٹن تھے، جو ایک طویل سفر کے بعد ہندوستان آئے تھے۔

یاسمین جانے ہی لگی تھی کہ ان کی گرجتی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

"رکو!" وہ نرمی سے کہہ کر اس کی جانب بڑھنے لگے۔

یاسمین تذبذب کے عالم میں اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔ وہ اس کے مقابل کھڑے ہوئے۔

"آپ ہیں یاسمین؟" نرمی سے بولے۔

یاسمین نے گردن ہاں میں ہلائی۔

فرینک ونسٹن کی آنکھیں اس کی آنکھوں میں پنپتے رنج کو دیکھ کر نم ہوئیں۔

"تو آپ ہیں وہ، جس کے لیے میرے بیٹے نے اپنی جان دی۔" آواز پہلے سے بھی زیادہ ملائم ہوئی۔

یاسمین کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا اٹک گیا۔ وہ انھیں پی جانے میں ماہر تھی۔ مگر آج، وہ انھیں چاہ کر بھی نہ پی سکی۔ آنکھوں سے بہتے آنسو اسکے گندمی رخسار بھگوتے چلے گئے۔

"آپ کی جان، یقیناً بہت قیمتی ہو گی۔ اچھا لگا آپ سے مل کر۔" وہ آنکھوں میں آئی نمی کو رگڑتے بولے۔

یاسمین نے گردن کو جنبش دی۔

"مجھے آپ یہ بتا سکتی ہیں، کہ یہ قتل کس نے کیا ہے؟" انھوں نے سوال کیا تو یاسمین کے ذہن کے خانوں میں اس رات کا منظر چکر کاٹنے لگا۔

"جیمس۔ پولیس افسر ہے وہ۔ وہ ہمیں مارنے آیا تھا۔ سزا کے خوف سے وہ نہ جانے کہاں چھپا بیٹھا ہے، مگر ہمیں یقین ہے آپ اسے بخشیں گے نہیں۔" وہ چاہ کر بھی آواز ہموار نہ رکھ سکی۔ اندر سے ٹوٹ جو گئی تھی، رعب و دبدبا سب خس و خاک تلے دب کر مسخ ہو چکا تھا۔

فرینک کی آنکھوں میں شعلہ بھڑک اٹھا۔

"بالکل۔ اس کو سزا دلوائے بغیر میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔" وہ اٹل انداز میں بولے۔

یاسمین کی آنکھوں میں نفرت ابھری۔ اس دن کا انتظار وہ پچھلے چھ ماہ سے کر رہی تھی۔ اور آئندہ بھی کر سکتی تھی۔

کچھ دیر دونوں کے درمیان خاموشی حائل رہی۔ وہ اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے، جس کی آنکھوں سے ایسا لگتا تھا

وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔

"کیا ہم آپ سے ایک درخواست کر سکتے ہیں؟" بالآخر وہ بول اٹھی۔

"جی، ضرور۔" فرینک ونسٹن نے جواب دیا۔

یاسمین نے مڑ کر اس میز کو دیکھا، جہاں اس کے کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔

"ہم جانتے ہیں، اس کی ساری چیزیں آپ لے جائیں گے۔ اور یہ کاغذات بھی۔ مگر کیا آپ اس کتاب کو چھپوا کر، اس کی ایک جلد ہمیں بھجوا سکتے ہیں؟" اس کی التجائیہ آواز نے کمرے کا سکوت توڑا۔

فرینک نے اس لڑکی کی آواز میں کرب محسوس کیا، تو ان کا دل پسپا ہو گیا۔

"ضرور۔ میں آپ کو ضرور بھجوا دوں گا۔" وہ نرمی سے گویا ہوئے۔

"ہم انتظار کریں گے۔"

اتنا سا کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔

باہر کا سفر طے کرتے ہوئے اسے البرٹ شدت سے یاد آیا۔

اور پھر سرائے کے باہر اس کی سائیکل دیکھ کر اس کا رونے کا جی چاہا۔

یا اللہ! کیا اب وہ ایسے ہی وقت بے وقت یاد آتا رہے گا؟

وہ سائیکل کے سرہانے کھڑے، اسے محویت سے دیکھتے یہی سوچ رہی تھی کہ۔

البرٹ تو اس سے اپنی محبت کا اقرار کر چکا تھا۔

مگر وہ، وہ بد قسمت تھی جو کبھی اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکی۔

وہ اس کی محبت کا اظہار سننے سے پہلی ہی چلا گیا۔

......☆☆☆......

دسمبر، ۱۹۴۵

امرتسر، ہندوستان

انگیزشِ عدل

وہ دن آج بھی یاد بڑے آتے ہیں
جب شامیں یہ سہانی ہوتی تھیں
آپ جو ہمارے ہم راہ تھے،
باغ کی اس بینچ پر،
درختوں کی چھاؤں تلے،
ہم زمانوں کی باتیں کرتے تھے،
آپ کچھ ہماری سنتے تھے۔
کچھ اپنی سناتے تھے۔
مگر وقت نے صفحے پلٹائے اپنے،
جو ہر کچھ سفاک دکھائے اپنے
کر دی راہیں ہماری جدا کچھ اس طرح
کہ نہ ہے امیدِ وصل،
نہ ہی ملا دل کو قرار۔
اور دل سے چمٹ گیا کبھی نہ ختم ہونے والا ملال
ہاں کیا ہوا باغ کی وہ بینچ آج بھی وجود رکھتی ہے
ہوائیں آج بھی احاطہ اس کا کرتی ہیں
زندگی اب کہ یک رنگ ہوئی چلی ہے
کیونکہ آپ جو اس میں نہیں ہیں۔
سب کچھ ہے، بس آپ ہی تو نہیں ہیں!
ملے تھے جو راہِ غیر میں آپ ہمیں،

انگیزشِ عدل

نہ جانتے تھے بچھڑنا قسمت میں لکھا تھا۔
ہاں بہت کچھ جو کہنا تھا کہہ نہ سکے
مگر روگ تقدیر نے اتنے دیے،
ہم مزید گلے کیونکر کریں؟

امرتسر کی گلیاں، سائیکلوں کی رنگ رنگ، بچوں کی کھل کھلاہٹ سے بھری ہوئی تھیں۔ سورج کی کرنیں، اب کہ پرزور نہ تھیں۔ خنکی امرتسر کے احاطوں پر سوار تھی۔ ان دنوں میں باشندے موٹے کپڑوں کی تہوں میں دبے نظر آئیں گے۔

ایسی ہی ایک سڑک پر وہ چل رہی تھی۔ وہی، جسے سب یاسمین بلاتے تھے۔

جس کے چہرے پر عمر کی لکریں تھیں۔ بال سیاہ تھے، مگر کچھ لٹیں سفید پڑ رہی تھیں۔ آج بھی، اس کے چہرے کا رعب برقرار تھا۔ آج بھی اس کی گردن ترشان اکڑی ہوئی تھی۔ آج بھی، مرد حضرات اسے دیکھتے ہی نظریں جھکا لیتے اور اسے سلام پیش کرتے۔

اس کے پیچھے، ایک شہد رنگ آنکھوں والا برطانوی نوجوان چل رہا تھا۔ ہاتھ میں کاغذ اور قلم لیے وہ اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ یاسمین کے چہرے پر پھیلے اطمینان سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس نوجوان کی موجودگی سے نہ صرف باخبر تھی، بلکہ اسے کوئی مسئلہ بھی نہ تھا۔

تب ہی اس گلی سے ایک بگھی گزری۔ یاسمین تھم کر اس بگھی کو دیکھنے لگی۔ بیک وقت کئی یادوں نے ذہن پر دستک دی۔

نوجوان بھی اس کے ساتھ رک گیا اور اس کی سیاہ آنکھوں کو بغور دیکھنے لگا۔ سیاہ آنکھیں یکدم اس جہاں سے منقطع ہو گئی تھیں۔

”ڈیوڈ۔ بگھیاں ہمیں البرٹ کی یاد دلاتی ہیں۔ ہم دو جمعے، اس کے ساتھ گئے تھے، اپنی بہنوں کو راشن دینے۔ ایک دفعہ رام باغ گارڈن بھی گئے تھے۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

انگیزشِ عدل

ڈیوڈ نامی نوجوان اپنی کتاب میں کچھ تحریر کرنے لگا۔

"اب تو بگھیاں کم نظر آتی ہیں۔ زمانہ بدل رہا ہے۔" لبوں پر اداس مسکراہٹ پھیلی۔ آنکھوں کے قریب جھریاں پڑیں۔ اس نے مڑ کر اس شہد رنگ آنکھوں والے نوجوان کو دیکھا۔

"کیا کہتے ہیں انھیں۔" آنکھیں چھوٹی کیے ذہن پر زور ڈالا۔ "ہاں! موٹر کار۔ بائیک۔ وہ زیادہ دکھائی دیتی ہیں اب۔" پھر سے گردن پھیر لی۔

"مگر جب بھی کسی بگھی کو دیکھتے ہیں، تو صرف وہ یاد آتا ہے۔" پر فسوں سا سانس خارج کرتے، وہ چل پڑی۔ اس کی چال، جوانی کے دنوں کے برعکس قدرے سست ہو گئی تھی۔

چلتے چلتے وہ دونوں چمنِ گلاب کے سامنے جا پہنچے۔

یاسمین وہاں رک گئی۔ مخصوص جگہ پر انگلی سے اشارہ کر کے ڈیوڈ کو متوجہ کیا۔ ڈیوڈ آنکھیں چھوٹے کر کے سڑک کے اس مقام کو دیکھنے لگا۔

"یہاں۔ وہ یہاں اپنی سائیکل پارک کرتا تھا۔ روز کچھ نہ کچھ نئی چیز خریدتا تھا۔" آواز میں اپنائیت تھی۔

ڈیوڈ اس کی آنکھوں کا جائزہ لیتے ہوئے، اپنی کتاب میں کچھ لکھنے لگا۔

چمنِ گلاب میں رش لگا ہوا تھا۔ ملازمائیں یہاں سے وہاں دوڑیں لگا رہی تھیں۔ ہر سو ہر دم وہ دلفریب مہک بکھری ہوئی تھی۔

وہ چمنِ گلاب کے بیچ و بیچ رک گئی۔ ڈیوڈ کو آنکھ سے اشارہ کر کے، ایک میز کی طرف انگلی اٹھائی۔

"یہاں۔" ڈیوڈ نے اس میز کو دیکھا "وہ ہمیشہ یہاں بیٹھتا تھا۔ اب اس میز پر ہم کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ہم روز کا اخبار یہاں رکھوا دیتے ہیں، کیونکہ وہ روز ادھر بیٹھ کر اخبار پڑھا کرتا تھا۔" پرانے وقتوں کو یاد کرتے ہوئے، وہ پھیکا سا مسکرا دی۔

مصروف ترین دن کا آغاز ہوا۔

سارا وقت ڈیوڈ یاسمین کے ساتھ رہا۔ وہ اس سے بہت باتیں کر رہی تھی۔ وہ اس سے سوالات پوچھتا۔ وہ

جوابات دیتی۔ اور وہ ایک ایک چیز اپنی کتاب میں لکھ دیتا۔

مغرب کا وقت آ پہنچا تھا۔

سیدہ یاسمین ڈیوڈ کے سنگ واپسی کے سفر پر گامزن تھی۔

گھر کے باہر رک کر اس نے گلی کے ایک حصے پر اشارہ کیا۔ ڈیوڈ نے بدستور وہاں دیکھا۔

"یہاں۔" یاسمین کی آنکھوں میں خالی پن اتر آیا۔ اب کی بار جو یاد ذہن پر جگمگائی تھی، وہ دکھ بھری تھی۔ وہ تکلیفدہ تھی۔

"یہاں اس نے اپنی آخری سانسیں لی تھیں۔"

ڈیوڈ کی آنکھوں میں سائے سے لہرائے۔ اس نے افسردگی سے سانس خارج کی۔ یاسمین کو نظر اٹھا کر دیکھا، جس کے گندمی چہرے پر کرب کے آثار تھے۔

"یہ گلاب۔ ان کی بنیادیں اسی نے رکھی تھیں۔" کیاری کو دیکھتے ہوئے، وہ اداس سا مسکرادی۔

"اس کے قاتل کا کیا انجام ہوا، لیڈی یاسمین؟" جوان مرد نے مودٔبانہ انداز میں پوچھا۔

"سزائے موت۔" وہ سختی سے بولے۔ "اس کے والد، فرینک ونسٹن نے اس پر ہلکا ہاتھ نہ رکھا۔ اسے سرِعام گولیوں سے بھونا گیا تھا۔ اس کے جسم کا ایسا ایک حصہ نہ تھا جہاں چھید نہ ہو۔" آنکھوں میں پرانی کوئی نفرت، کوئی رقابت اتر آئی۔

ڈیوڈ کی آنکھوں میں ستائش ابھری۔ اس نے سر اثبات میں ہلائے صفحوں پر مزید کچھ لکھ ڈالا۔ اسی اثناء میں یاسمین نے گھر کا دروازہ کھولا۔

"اندر آجاؤ۔ کچھ کھا کر جانا۔" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

ڈیوڈ دعوت نامہ منظور کرتے اندر داخل ہوا۔

میز پر کھانا سجا ہوا تھا اور وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ڈیوڈ غور سے اس گھر کا جائزہ لے رہا تھا۔

"ایک سوال پوچھ سکتا ہوں، لیڈی یاسمین؟" وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

یاسمین پھیکا سا مسکرائی۔

''اب تک اتنے پوچھے ہیں۔ پہلے روکا جواب رو کیں گے؟''

ڈیوڈ جواباً شگفتگی سے مسکرایا۔

''سب نے کہا تھا، کہ آپ کبھی بھی مجھے اپنے اوپر کتاب لکھنے کی اجازت نہیں دیں گی۔ آپ ایک دیوار کی طرح ہیں، آپ کبھی بھی خود کو نہیں کھولیں گی۔ پھر آپ مجھ پر مہربان کیوں ہوئیں؟''

یاسمین کی سیاہ آنکھیں کسی سوچ میں ڈوبیں۔ پھر اس نے نظر اٹھا کر اس شہد رنگ آنکھوں والے نوجوان کو دیکھا۔

''سب ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ تمھاری شہد رنگ آنکھوں نے ہمیں تم پر مہربان ہونے پر مجبور کیا۔ کیونکہ البرٹ کی آنکھیں بھی شہد رنگ تھیں۔'' آواز میں خالی پن کے ساتھ ساتھ کرب جھلک رہا تھا۔

ڈیوڈ زیرِ لب ہنس دیا۔

''کیا آپ مجھے ان کی کتاب دکھا سکتی ہیں؟ آپ کے پاس، سب سے پہلی جلد ہو گی۔'' ڈیوڈ نے التجا کی۔

یاسمین سر کو خم دیتے کھڑی ہو گئی۔

کچھ دیر بعد وہ ایک کتاب کے ساتھ واپس آئی۔

اسے کپڑے کے اندر لپیٹا ہوا تھا۔ یاسمین نے اس کتاب کو میز پر رکھا۔ ڈیوڈ نے بہت احتیاط سے اسے اٹھایا اور کپڑے کی تہوں کو کھولا۔

اندر سے سفید سرورق والی خوبصورت کتاب برآمد ہوئی، جس کے سرورق پر ہندوستان کے مشہور مقامات کے نقش بنے تھے۔ ڈیوڈ کتاب کی خوبصورتی دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

اس کے سرورق پر لکھا تھا: ''رنگوں کا دیس۔''

ڈیوڈ نے سرورق پلٹا۔ پہلا صفحہ اس کی آنکھوں کے سامنے اجاگر ہوا۔

''انتساب۔۔۔

انگیزشِ عدل

یہ کتاب، میں سیدہ یاسمین مجاہد کے نام کرتا ہوں،
وہ بہادر ہستی جس نے میری آنکھیں کھول دیں،
اور مجھے ایک مشکل، مگر اہم سچ سے متعارف کروایا۔"

ڈیوڈ نے ان لفظوں پر اپنا ہاتھ پھیرا۔ اس کتاب کو لکھنے والا تو جا چکا تھا۔ مگر اپنے الفاظ کے ذریعے، صدیوں کے لیے دنیا میں چھاپ چھوڑ گیا تھا۔

ڈیوڈ نے کتاب بند کی اور کپڑے کی تہہ میں اسی طرح سے محفوظ کر دی، جس طرح سے ملی تھی۔

اس نے نظر اٹھا کر یاسمین کو دیکھا جو لاتعلق سی بیٹھی فرش پر کسی غیر مرئی نقطے کو تک رہی تھی۔

"کیا آپ مسکراتی نہیں ہیں، لیڈی یاسمین؟"

سوال پر یاسمین کی آنکھیں ویران ہوئیں۔

"ہم ہمیشہ سے ایسے نہ تھے، ڈیوڈ۔" اس نے پر فسوں توقف لیا۔ "ہم سے زندگی نے پہلے ایک دفعہ مسکرانے کی وجہ چھینی۔ پھر البرٹ کو بھیجا، ہم نے مسکرانا دوبارہ سیکھا۔ لیکن زندگی نے ہمارے مسکرانے کی وجہ دوسری مرتبہ بھی چھین لی۔"

ڈیوڈ نے اس کی آواز میں گھلی نمی محسوس کی تھی۔ دل بھاری ہونے لگا تھا۔

"کوئی آخری پیغام، کوئی آخری بات جو آپ چاہتی ہوں اس کتاب کا حصہ بنے؟" ڈیوڈ کی آواز نے اس رنجیدہ ماحول میں ارتعاش پیدا کیا۔

یاسمین نے کچھ دیر سوچ کر نظریں جھکائیں۔ پھر آنکھوں میں اعتماد لیے ڈیوڈ کو دیکھا۔

"ہم آنے والی نسل سے مخاطب ہیں۔ ہمارے لوگ، آزادی کے دہانے پر ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب ہندوستان پر سے غیروں کا راج ختم ہو جائے گا۔ ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ ایک نسل ایسی آئے گی، جو آزادی میں اپنی آنکھیں کھولے گی۔ جو ذہنی طور پر آزاد ہو گی، جس کی آواز کو دبایا نہ جائے گا۔ یہ آزادی آپ کے نام ہے۔ اس آزادی کو عزت کے ساتھ آپ نے آگے بڑھانا ہے۔ اس زمین کے لیے فائدہ بخش بننا ہے۔ اس زمین کے ساتھ دغا نہیں کرنا۔ ہم زمین

آپ کو سونپیں گے، ملک اسے آپ بنائیں گے۔

اور ہم ایک بات ہر اس شخص کو کہنا چاہیں گے جو آزادی کے لیے لڑ رہا ہے۔ آزادی کی اس جنگ میں یہ سوچ کر نہ لڑیں کہ آپ کو چوٹیں نہ آئیں گی، یا آپ کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ اپنے دلوں میں عدل کی انگیزش رکھنے والے سب کچھ گنوا دیتے ہیں۔ وہ آزادی کے لیے یا تو اپنی جان کی قربانی دیتے ہیں، یا پھر اپنے پیاروں کی۔ جب آزادی آپ کے قدموں کو چھوئے گی تب آپ اپنی ذات کو سب سے زیادہ گھائل پائیں گے۔"

اس نے بات مکمل کی۔ آنکھوں میں محرومی تھی، لفظ بالکل خالی، کھوکلے۔ اور دل، وہ تو سالوں سے بنجر تھا۔

ڈیوڈ نے سب کچھ صفحے پر اتار لیا۔

"میں اجازت چاہوں گا، لیڈی یاسمین۔ جب کتاب چھپے گی، ایک جلد آپ کو ارسال کروں گا۔" وہ سر کو خم کرتے، کھڑا ہوا۔

یاسمین بھی اسی کے ساتھ کھڑی ہوئی اور اسے دروازے تک لے کر گئی۔

"اس مہمان نوازی، اور اپنا قیمتی وقت دینے کے لیے مشکور رہوں گا۔" ڈیوڈ نے سینے پر ہاتھ رکھتے باادب سے انداز میں کہا۔

"خدا حافظ۔ اپنا خیال رکھنا۔" وہ پھیکا سا مسکرا دی۔

وہ چلا گیا تو یاسمین نے کچھ دیر اس پھولوں سے بھری کیاری کو دیکھا۔

انھیں دیکھتے ہی اس نے گہری سانس خارج کی۔ گہری پرفسوں سانس۔ بہت ستم یاد آئے۔ کئی چہرے یاد آئے۔ کئی نامکمل خواب دماغ میں بھٹکے۔ اور سب کچھ ہوا بھی ہو گیا۔

ٹھنڈ بڑھ رہی تھی۔ وہ اپنے بازوؤں کو مسلتے اندر چلی گئی۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے اس کیاری میں لگے پھول لہرانے لگے۔

جس کیاری میں کبھی صرف جمال کے دیے گئے یاسمین ہوا کرتے تھے۔

آج وہاں البرٹ کے دیے گئے گلاب بھی اپنی جگہ بنا چکے تھے۔

☆تمت بالخیر☆